THE HINDUSTANI ACADEMY.

हिन्दुस्तानी एकेडेमी, पुस्तकालय
इलाहाबाद

वर्ग संख्या.....

पुस्तक संख्या.....

क्रम संख्या.....606.....

اِنَّا مِنَ اللہ اِنَّا اِلَی اللہ - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ مَسْئُوْلُوْنَ

کم - ٹو - موت

حصہ اوّل

یعنی اصل عقبےٰ آخرت یاد دلانے اور عشق دنیا کی بھول سے بچانے میں

حصار الحیات

جسکو

کفن بر سر بستہ حسن نظامی دہلوی نے لکھکر لکھوا کر اور جمع کر کے کتاب کی

صورت دی،

اور پیرزادہ سید محمد صادق صاحب کارکن حلقۃ المشائخ دہلی نے

بماہ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ مطابق مئی ۱۹۱۷ء

شیخ فضل حسین صاحب کی لالہ پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

البرزخ

بین الحیات والممات

دست قدرت حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک کو خدا تعالیٰ نے اہل ہند کی حیات و ممات کا لحاظ طب پر برزخ الکبریٰ بنایا ہے ؛

میری کتاب موت یاد دلانے کو دنیا کے پاس جاتی ہے۔ دنیا موت سے جاں چھڑانے کو حاذق الملک کے پاس آتی ہے یہ کتاب کسی کو بن آئی اجل سے سکتی ہے نہ حاذق الملک کسی کی آئی ہوئی کو ٹال سکتے ہیں بلکہ وہ خود بھی ایک دن مرنے والے ہیں یہ کتاب سہی ہونے والی ہے اور اسکا مرتب کرنے والا بھی ؛

حاذق الملک جاں بچانے کا مجازی سہارا ہیں۔ یہ کتاب ایماں یاد دلانے کا حقیقی نقارہ ہے انکو خلقت اکثر آخری وقت پاس بلاتی ہے یہ کتاب اول وقت مخلوق کے پاس جاتی ہے وہ بھی برزخ الحیات والممات ہیں اور یہ بھی ؛

لہذا اس زمانہ میں جبکہ نسل آدم شوق زیست اور تمنائے لقا اور آرزوئے حیات دنیا میں آخرت و عقبیٰ کی زندگانی دوام کو بھول گئی ہے۔ میں یہ کتاب شائع کرتا ہوں اور خادم خلق اللہ حاذق من اللہ حکیم حاذق الملک نام اسکو منسوب کرکے کم تو دار البقا میں دار الفنا پکارتا ہوں ؛ میں نہ رہونگا۔ حاذق الملک نہ رہینگے مگر نسبت نامہ قیامت تک زندہ رہیگا۔ یہ کتاب حشر تک باقی رہیگی۔ اور منسوب الیہ کے ہم حاذق کو بھی خدا اسکے ساتھ تعالیٰ طویل دیگا ؛

محرر بیسرا درگاہ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ
دہلی۔ مئی ۱۹۱۷ء

حسن نظامی

کم ٹو موت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جس قوم کا زوال قریب ہوتا ہے وہ موت کے وقت کو بھول جاتی ہے یا جان بوجھ کر مرنے کا خیال سامنے نہیں آنے دیتی۔ تاکہ عیش زندگی کیر کرانہ ہو قلعہ دہلی کے قصے مشہور ہیں کہ اُن مغل بادشاہوں کی اولاد جنہوں نے ہمیشہ دریائے مرگ کے کنارے کھڑے ہو کر ملک فتح کئے۔ اب آخر زمانہ میں ایسی ہو گئی تھی کہ اگر کوئی اسکے سامنے کلمہ توحید پڑھتا تو وہ کانوں میں اُنگلیاں دے لیتی تھی تاکہ وہ چیز جو مرتے وقت پڑھی جاتی ہے کانوں میں نہ پڑے سورۂ یسین کو قلعہ دہلی کی بیگمات نتاوی کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ یعنی مار ڈالنے والی سورت اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ وہ جب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زیارت کو آتے تو محمد شاہ بادشاہ کے مقبرہ پر پردے

ڈلوادیئے جاتے تھے کیونکہ امیروں وزیروں کو خوف تھا کہ
کہیں بادشاہ کی نگاہ بادشاہ کی قبر پر نہ پڑ جاے اور زندگی کے
انجام کار کا دھیان انکو تکلیف نہ دے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ موت ان سب کو کھا گئی۔ عیش و عشرت ملیامیٹ
ہو گئے اور آج انکی خوابگاہوں میں یورپ والے چوتیوں سمیت
سیر کرتے پھرتے ہیں۔
یہ بڑے خوف کا مقام ہے۔ انسان کو ہر وقت آخری منزل کا
کھٹکا دل میں رکھنا چاہیئے۔ ہمارے آقائے نامدار مقبول پروردگار
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص رات دن میں چالیس
مرتبہ موت کو یاد کرے وہ شہید کا درجہ پائیگا۔ اسکی وجہ صاف ظاہر
ہے کہ شہید کو تو ایک دفعہ موت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ مگر جو شخص رات
دن میں چالیس دفعہ موت کا خیال کرے تو وہ گویا ہر بار موت کا
ذائقہ چکھتا ہے۔ اس لیے اس کا رتبہ شہید کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے
ہمارے رسول صلعم موت کو اس قدر قریب جانتے تھے اور ہر وقت
مرنیکے لئے اتنے آمادہ رہتے تھے کہ اگر آج کل کے آدمی اُس کا
ذکر سنیں تو حیران ہو جائیں۔ ایک دفعہ آپ نے چاروں اصحاب
رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت کیا کہ تم موت کو کتنا قریب

سمجھتے ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کی صبح کی نماز پڑھنے کے بعد مجکو امید نہیں رہتی کہ ظہر کی نماز تک زندہ رہوں گا فاروق اعظمؓ نے کہا کہ میں ظہر پڑھ کر عصر کا وقت ملنے سے ناامید ہو جاتا ہوں۔ عثمان غنیؓ بولے مجکو عصر کے بعد مغرب کی آس باقی نہیں رہتی۔ حیدر کرارؓ نے التماس کی کہ مغرب ادا کرنیکے بعد عشا کا بھروسہ نہیں رہتا یہ سنکر ہمارے آقا رسول نامدار نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جسکے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ جب میں نماز میں ائیں طرف سلام پھیرتا ہوں تو مجکو بائیں جانب گردن پھیرنے کا یقین نہیں رہتا اور خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے پہلے موت آجائے

جنکو مرنے کا اتنا یقین تھا وہ آج کا کام آج ہی ختم کر دینا چاہتے تھے اس واسطے ان میں نہایت مستعدی چستی اور استقلال کے اوصاف پائے جاتے تھے۔

اب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ کالر نکٹائی لگا کر بوٹ پہن کر ہوا خوری کو نکلتے ہیں اور راستہ میں کوئی جنازہ مل جاتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ ہمکو ڈر ہوتا ہے کہ مرنے کا خیال ہمارے دماغ کو مضمحل کر دیگا اور ہم کچہری کا کام اچھی طرح نہ کر سکیں گے۔ مگر کاش ہمکو بہادر شاہ کی مذکورہ مثال سے عبرت ہو جنھوں نے دماغ کی حفاظت میں

ملک غارت کردیا یقین مانو اگر ہم موت کے خوف سے اسکو بھولنا یا بھلانا چاہیں گے تو ہماری ہستی ناپید ہو جائیگی اور فنا ہمارے بقائے ظاہری کو نابود کردے گی۔

یہ جتنے امیر اور روپئے والے لوگ ہیں یا یہ جسقدر تاج و تخت کے مالک کہلاتے ہیں موت کے نام سے ان کا دم فنا ہوتا ہی۔ مرنے کا ذکر کرو تو ان کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں بات کاٹ کر اور ذکر کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کو خبر نہیں موت کا وقت قریب آرہا ہی۔ وہ ایک دن انکی گردن مروڑ کے رکھ دیگا۔ ان کا سب یہ مال و دولت تاج و تخت دوسروں کے حصہ میں تقسیم ہو جائیگا۔

اس دن یہ چار گز کپڑے کے کفن کو دوسروں کے محتاج ہوں گے اور جو لوگ آج انکی خیرخواہی میں پسینہ پر خون گرانا چاہتے ہیں جھوٹی مخبریاں کرکے ان کے ہاتھوں سے بے گناہوں پر ظلم کراتے ہیں وہ بیک بینی و دوگوش قبر کی اندھیری کوٹھری میں پھینک کر چلے آئیں گے جہاں نہ برقی لیمپ ہونگے نہ گیس کے ہنڈے البتہ دوزخ کی آگ کے شعلوں اور قہر خدا کے شراروں اور عذاب کے فرشتوں کی چمکتی ہوئی خوفناک آنکھوں کی روشنی ضرور ہوگی۔

لوح محفوظ اور اوراق مستور کے حجابات اُٹھ جائیں تو
میں ان کو وہ سب کچھ دکھا سکتا ہوں جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں
مگر قدرت ان پردوں کی ڈوری پکڑے کھڑی ہے کسی کو چھپے ہوئے
بھید تک جانے نہیں دیتی۔ اور جو جا سکتے ہیں اُنکو کہنے نہیں دیتی
کس بھول میں ہو۔ وقت آخر آن پہنچا۔ کوچ کی تیاری کرو۔ ریل کا
لائن کلیر ہو چکا اور تمنے ابتک بستر بھی نہیں باندھا۔
یہ جو عشرت خانوں میں کمانی دار پلنگ پر پڑے خراٹے لے
رہے ہیں۔ یہ جو تفریح اور ہنسی خوشی کو باعث زندگانی سمجھتے ہیں
یہ جو یورپ میں بیٹھ کر تمہارے لئے کتابیں لکھتے ہیں کہ خوب ہنسو
عمر دراز ہوگی۔ موت کا فکر پاس نہ آنے دو ہمیشہ سلامت رہو گے
یہ سب کے سب نزع کی بیقراری میں بہت جلد گرفتار ہونیوالے ہیں
اسوقت ان کی زبان بند ہو جائے گی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیگی
ایڑیاں رگڑینگے۔ ٹانگیں بیچینی اور بے کلی سے کبھی سمیٹیں گے۔
کبھی پھیلائینگے۔ یاروں دوستوں۔ بال بچوں۔ مال دولت۔
گھر بار کو حسرت و مایوسی سے دیکھیں گے۔ سانس سینے میں
ٹھوکریں کھائیگا بدن ٹھنڈا پڑ جائیگا۔ دم کھنچ کھنچ کر آنکھوں میں آئیگا
اور ان میں نشتر چبھوئیگا۔ جس طرح یہ زندگی میں دوسروں کی دل آزاریاں

کرتے تھے نام نمود کے لیئے پرائی جانوں کو بے گناہ برباد کرتے تھے۔ تاج و تخت کی ہوس میں دغا فریب ظلم و ستم۔ جفا کاری و خونریزی انکا شیوہ ہوگیا تھا آج انکی آنکھوں کے حلقوں میں حساب کتاب کے دفتر کھولے جائینگے آج انکو معلوم ہوگا کہ جس سے ڈرتے تھے۔ گھبراتے تھے۔ چھوت کا انتظام کرتے تھے۔ صفائی اور ڈس انفکٹ پر توکل کرتے تھے۔ وہ چیز کسی سے نہ رکی اور آگئی اب یہ سارا ساز و سامان دھرا رہ جائیگا۔ اب کوئی ڈاکٹر نہیں ہے جو جان کو بچائے اب کوئی پہرہ والا نہیں ہی جو موت کے فرشتے کو اندر آنے سے روکے۔ اس گھڑی کس کی مجال ہی کہ ڈپلومیسی اور پالیسی سے موت کی بلا کو ٹالے سب لن ترانیاں ہیچ ہوگئیں۔ سارے طرار باں عاجز آگئیں۔ قصہ مختصر موت یاد رکھنے کی چیز ہے۔ ہندوستانیوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہی کہ ان کو وقتاً فوقتاً بار بار یاد دلایا جائے اگر ان کو کام کا آدمی بنانا ہے تو صاف صاف کہنا چاہیئے کہ جتنی زندگی ہے اس کو غنیمت جانو اور نیکی و پارسائی سے کام شروع کرو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ کل خبر نہیں کیا پیش آجائے۔ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔

دولہا دلہن کی موت

جودت نصرتی اکیس سالہ ترک زادہ ایڈریانوپل کے محاصرے سے ایک دن پہلے اپنی سسرال میں خوش و خورم بیٹھا سگرٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اسکی شادی کو پورے سات دن بھی نہیں ہوئے تھے ارمان بھری دلہن کے سوا کمرہ میں کوئی نہ تھا ترکوں کے دستور کے موافق یہ لڑکی بھی گانا اور باجا بجانا جانتی تھی اسلئے شوہر کی خوشنودی خاطر اسنے اپنا سریلا قانون باجا بجانا شروع کیا۔

جودت۔ باجے کی مستانہ نوائوں سے جھومنے لگا۔ اُسنے اپنی کرچ کو زمین پر ٹیک کر بغل میں دبا لیا۔ اور اپنی گبسو دراز بیوی سے جنگی گیت گانے کی فرمائش کی۔ شرمیلی نرگس نے مسکرا کر دھیمی مگر سمجھ میں آنیوالی آواز سے "بسر و چشم" کہا۔ اور بولی۔ آپ یہاں بھی قتل گاہوں کو نہیں بھولتے۔ جودت نے اپنی چھوٹی سی سُرخ مونچھ کو مروڑا۔ اور کہا۔ ہاں میں عشرت خانوں کی بہار میں جنگ کے خارستان کو یاد رکھنا قومی فخر سمجھتا ہوں۔ تم انگلیوں سے کھوڈ قانون کے نغموں میں میری خوراک پیدا کریں۔ اور تم اپنی شیریں آواز سے اس پر نمک ڈالو۔

قانون کے بھاری سُر زنان خانے میں گونجنے لگے۔ اور ترکن نے یہ گیت شروع کیا۔ جب جوانمردوں نے تیغ کے قبضہ پر ہاتھ رکھا۔ دشمن تھرّا گیا۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ اور جب توپوں کو بتّی دکھائی گئی۔ پہاڑ اور جنگل حواس باختہ ہو گئے۔ ہمارے سپاہیوں نے آج خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کھڑے کھڑے قہوہ کی پیالی پی۔ کیونکہ وہ جاں سے ہاتھ دھو کر میدان میں نکلے تھے۔

جودت اس نغمہ سرائی میں محو تھا اور باہر اسکو کوئی شخص آواز دے رہا تھا۔ قانون کی آواز ذرا مدہم پڑی تو اُسنے سنا کوئی اُسکو پکارتا ہے فوراً باہر نکلا۔ دیکھا شکری پاشا کا ایڈیکانگ ہے۔ اُسنے کہا نصرتی دشمنوں کی فوجیں قریب آگئیں۔ شکری آفندی نے یاد فرمایا ہے کہ کپتان جودت نصرتی جس حال میں ہوں فوراً ہمراہ لیکر آؤ۔

جودت اُلٹے قدموں اندر آیا۔ بیوی سے رخصت ہوا۔ کرچ لگا۔ ٹوپی سر پر رکھ ایڈیکانگ کے ساتھ چل دیا۔

غنیم نے ایڈریانوپل کو گھیر لیا تھا۔ شدت سے گولہ باری ہو رہی تھی پچھلی رات توپیں ذرا خاموش ہوئی تھیں کہ اتنے میں قلعہ کے باہر کچھ سوار نہایت سکوت کے عالم میں دشمن کی فوج کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دئے یکایک بندوقوں کے فیر کی آواز آئی۔

اندھیرے میں شعلے چمکے اور سامنے کی لائن میں افراتفری اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔

صبح کا نور نمودار ہوا۔ بلغاری لشکر نے ترکوں کو اپنے مورچوں پر سنگینیں مارتے دیکھا وہ گھبرا گئے۔ اوسان جاتے رہے۔ کپتان جودت نصرتی اور اُسکی بیوی گھوڑوں پر سوار تلواریں اُٹھائے ساتھیوں کو للکار رہے تھے۔

اسوقت بڑی گھمسان کا رن تھا۔ دلہن ترکن کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پستول سے اپنے دولہا پر حملہ کرنے والوں کا خاتمہ کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک ظالم بلغاری نے بندوق پر چڑھی ہوئی سنگین پیچھے سے اس مرادوں والی ناشاد دُلہن کی کمر میں ماری۔ جو سینے کے پار نکل گئی مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے پستول چھوٹ پڑا۔ اور بلبلا کر سینے کو تھام لیا گیا چند سکنڈ کے بعد وہ چکرا کر گھوڑے سے گری۔ اور موت کے وقت کے بے ربط الفاظ میں اتنا منہ سے نکلا۔ جودت خدا حافظ۔

ترک سوار اپنے افسر کی بیوی کا یہ عالم دیکھ کر چاروں طرف سے گھر کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اور دشمن پر غضبناک حملے کرنے لگے۔ جودت گھوڑے سے کود پڑا مرہٹی پلنگ پر لیٹنے والی کی لاش کو

خاک سے اُٹھالیا۔ پسینہ آلود پیشانی جسپر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی چومی۔ سنگین خوردہ سینے کو سینہ سے لگایا۔ اور بے قرار آنکھوں سے آسمان کو دیکھا۔ وہ خدا سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس قربانی کو قبول کرے۔ اسکا دل عشق اور مایوسی میں دیوانہ ہو گیا تھا مگر اسے دیکھا یہ وقت غفلت کا نہیں ہے۔ دشمن ساتھ کے سپاہیوں کو ختم کئے دیتا ہے۔ اسلئے اُسنے لاش دو سواروں کے سپرد کی کہ جس طرح ممکن ہو قلعہ میں پہنچاؤ۔ اور خود تلوار اُٹھا کر زخمی شیر کی طرح دشمن کی صفوں میں گھس گیا اسکی زبان پر ایک نعرہ تھا۔

میں توحید کا فدائی ہوں میں نے اپنی زندگی کی سب امیدیں ابھی وحدت کی قربانگاہ میں چڑھائی ہیں۔ اب میرے دل میں زندگی کی محبت نہیں ہے۔ اب میں عربی رسولؐ کی آبرو پر نثار ہونا چاہتا ہوں ہتھیار دو۔ میرے ساتھ چلو۔ جنت میں میری پیاری کا دل تنہائی میں گھبراتا ہوگا۔ تھوڑی دیر یہ آواز آئی۔ اسکے بعد دیکھا تو ایک تڑپتی ہوئی لاش گھوڑے سے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئی جسکے منہ سے آخری لفظ یہ نکلا (اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ)

یہ موت نصرتی دولھا کیتاں تھا جو اپنی دُلہن کے آدہ گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہوا۔ اور کہہ گیا کہ موت دولھا دلہن کو بھی آجاتی ہے وہ پھول میں رہیں

سکراتِ موت کی ہچکیاں

گرمی کے موسم میں محمد شاہ بادشاہ باغین باغ کے حوض پر شام کے وقت محفل جمایا کرتا تھا۔ حوض میں گلاب کیوڑے کے فوارے چھٹتے در و دیوار پر خس کا عطر چھڑکا جاتا اور پری چہرہ خواصیں عیش شاہ بادشاہ کو برابر پنکھا جھلتی رہتی تھیں۔

ایک دن گل خانم نام ایک گجرانی چھوکری عطر کا کنٹر لئے دیوار پر عطر چھڑکتی پھرتی تھی کہ بادشاہ محل سے برآمد ہو گئے۔ یہ لونڈی ہی آئی تھی گجرات کے حاکم نے بھیجی تھی۔ رعب شاہی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے اوسان ہو گئی۔ اور کنٹر ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا بادشاہ بالکل قریب آ گئے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک سترہ سالہ کنیز مظلوم صورت، نائے سہمی ہوئی کھڑی ہے کبھی شکستہ کنٹر کو دیکھتی ہے کبھی بادشاہ کی صورت کو۔ شاہی سواری رک گئی۔ پوچھا گیا کیا حال ہے۔ بولی شیشہ کا مرانی ٹوٹ گیا ہے سلطانی امید کے شکستہ شیشوں کو جوڑ دیا کرتا ہے دیکھتی ہوں یہ شیشہ بھی جڑتا ہے یا نہیں۔ اللہ پسند بادشاہ کو یہ برجستگی اور حاضر جوابی بھا گئی۔ فرمایا نام کیا ہے عرض کیا "دلشین بلبل"، ابتو بادشاہ بھڑک گئے۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا چپکے سے

آداب بجالائی اور ہاتھ باندھ نظریں نیچی کر دوزانو بیٹھ گئی۔ ارشاد ہوا
بلبل کا نشیمن ایک جگہ نہیں رہتا آج اس گلستان میں کل اُس چمن
میں یہ سوں کسی اور غنچہ پر عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے یہ
لونڈی وہ گل ہے جسکو دیکھ کر بلبل پھر کسی پھول کے پاس نہیں جاتا
ایک ہی جگہ نشیمن بنا لیتا ہے۔

حکم ہوا اس کو محل میں لیجاؤ۔ نہلاؤ۔ دھلاؤ۔ حرم شاہی بناؤ۔ چند روز
کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ گل خانم تمام محل کی بیگمات سے زیادہ منظور نظر
بن گئی۔ ایک لمحہ کے لئے بادشاہ اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے
تھے۔ ایک برس تک یہی عالم رہا۔ دوسرے سال سردی کے موسم
میں گل خانم بادشاہ کے پاس تھی۔ کروٹ جو لی تو بچھونے میں کوئی
چیز چبھی۔ اور پسلیوں میں جلن ہونے لگی۔ پاس ادب مانع تھا۔
ضبط کیا مگر نہ ہو سکا۔ بے اختیار منہ سے اُف نکل گئی۔ بادشاہ گھبرا کر
پوچھنے لگے خانم کیا ہوا۔ خیر ہے۔ بولی جہاں پناہ خاطر جمع فرمائیں
کوئی تردد کی بات نہیں ہے دل کے پاس کوئی چیز خلش کرتی ہے
حضور نے اسی وقت بھرے والے کو آواز دی لونڈیاں حاضر
ہو گئیں۔ شمع مرتب لائی گئی۔ بچھونے کو دیکھا تو ایک چھوٹا سا نشتر
چارپائی میں اس قرینے سے رکھا ہوا تھا کہ نوک کروٹ لینے والے کے

چبھ جاے - فوراً گل خانم کی گرم صدری اُتاری گئی - دیکھا دل کے پاس ہلکا سا ایک زخم ہے حکیموں - جراحوں کی طلبی ہوئی - آن کی آن میں سب حاضر ہو گئے - تفتیش سے معلوم ہوا کہ کسی بیگم نے رشک و حسد سے زہر کا بجھا ہوا نشتر رکھوا دیا تھا - وہ چبھا ہے - اب جان کی خیر نہیں کیونکہ دل قریب ہے زہر اثر کر چکا -

بادشاہ ہائے کر کے بیہوش ہو گئے - گل خانم نے الہ انتقال کو ہاتھ سے نہ دیا - گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی - اپنے تمام زیورات اور کپڑے طلب کئے - پلی ہوئی آغا مینا کا پنجرا بھی منگوایا اور سب چیزوں کو سامنے رکھ کر نگاہ حسرت سے دیکھا -

بیمارات کے سبب چپ تھی - اُس سے مخاطب ہو کر بولی لو پیاری تمہاری چاہنے والی دنیا سے رخصت ہوتی ہے - اب تم خدا کے حوالے - خبر نہیں میرے بعد تم پر کیا گزرے

اتنا بولنے پائی تھی کہ زہر کا اثر خون پر چھا گیا - گردن ڈھلک گئی - منہ میں کف آنے لگے - لونڈیوں نے دوڑ کر سہارا دیا - حکیم جراح دوائیں لیکر آ گئے مگر اس کا تو کام تمام ہو چکا تھا - شاہی خوابگاہ کی آرایش کا کیا کہنا - چپہ چپہ بہشت کا نمونہ تھا کافوری شمعیں روشن تھیں چھپر کھٹ میں بادشاہ سیوتی پڑے تھے جن کو خوشبوئیں

اور دوائیں سونگھا کر ہوشیار کیا گیا۔

بادشاہ اُٹھے۔ گل خانم کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور دو آنسو اُسکے اُداس چہرے پر ٹپکائے۔ خانم نے ذرا کی ذرا آنکھ کھولی اور کہا میرے آقا۔ میرے سلطان۔ میرے مالک۔ میرے تاجدار۔ پانی ایک گھونٹ۔ کلیجہ پھُنکا جاتا ہے۔ اتنے .. قام . . نہ لہ . . . یا جا اُف۔ آہ۔ ہیں۔ آہ۔ آہ۔ پانی۔ پیاس۔ میں جا نہار، نامراد، جاتی ہوں اب اس زانو پر اور . . تھوڑا سا پانی۔ اس زانو پر اور سر ہوگا شمعیں ساتھ بھیجدو۔ قبر میں اندھیرا ہوگا میرے زیور میری سوکنوں کو نہ دینا۔ اللہ۔ اللہ۔ اوہ۔ مجھے اُٹھاؤ برف میں ڈالدو۔ آ۔ آ۔ آگ بدن میں۔ قاتل کو مہاگ۔ مبارک ہم تو چلے۔ وہ بھی ایک دن اسی طرح پھڑکتے تڑپے۔ لا الہ الا اللہ۔ الا اللہ۔ الا اللہ۔ محمد۔ محمد رسول رسول اللہ۔

یہ کہنے پائی تھی کہ غش آگیا۔ بدن تھرتھرانے لگا۔ آنکھیں پتھرا گئیں ناک کا بانسہ ڈھل گیا۔ اور زور سے ایک ہچکی سسکی کی طرح آئی۔

حاضرین نے بادشاہ سے عرض کیا۔ حضور اب ان میں کیا رکھا ہے دوسرے کمرے میں تشریف لے چلئے یہ سُنکر بادشاہ نے مرے والی کا سر زانو سے اُتار دیا اور تشریف لے گئے جانے کے بعد

گل خانم کو دو ہچکیاں آور آئیں ۔ اسکے بعد سکرات موت اور زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اے اس عبرت نامہ کے پڑھنے والو۔ سب کو یہ وقت پیش آنا ہے۔ اس سے غافل نہ رہو۔ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور اُس زندگی کا اسباب راحت خرید جہاں موت نہیں ہے۔

قبر کی اشرفیاں

ایک کنجوس روپیئے والے کی موت کا بیان

ایک شخص بہت مالدار تھا۔ اسکے کئی بچے تھے۔ مگر وہ اپنی دولت خرچ کرنی نہ چاہتا تھا۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتا اُبالی دال کھاتا۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے بچھونے پر سوتا اور اسی حال میں بچوں کو رکھتا تھا۔

جب بچوں نے ہوش سنبھالا تو انھوں نے خیال کیا۔ ہمارا باپ اتنا پیسے والا ہے۔ مگر ایسے غریبی حال میں کیوں رہتا ہے۔ ایک دن انھوں نے باپ سے پوچھا کہ باوا جان یہ کیا بات ہے کہ اور لوگ جب اُنکو خدا کھانے پینے کو دیتا ہے تو اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اچھے سے اچھا پہنتے ہیں لیکن آپ ہمیشہ مفلس کنگالوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ہم کو بھی رکھتے ہیں۔ آخر یہ دولت کس دن کام آئیگی

باپ نے ہنسکر کہا۔ نادان روپیہ جمع کرنے کے لئے ہے
یا خرچ کرنے کے واسطے۔ یہ جتنے اُجلے اُجلے کپڑے والے سفید
پوش بازاروں میں پھرتے ہیں بس یہ اُنکا خالی لفافہ ہی
اندر کچھ بھی نہیں۔ وقت پڑے تو دو روپئے بھی ان کے گھر میں
نہ نکلیں۔ اور میں چاہوں تو لاکھوں روپیہ ایک وقت میں نکال
سکتا ہوں۔ یہ سنکر بچوں نے کچھ اور بولنا چاہا مگر باپ نے دھمکا کر
چپکا کر دیا۔ اور کہا میں زیادہ باتیں نہیں سنتا آدمی کو چاہیئے کمائے
اور جمع کرے۔ خرچ کرنیکا نام لوگے تو گھر سے نکال دونگا۔

بڑے بیٹے کو یہ بات بہت بُری لگی اور تاک میں رہا کہ باپ
کی آنکھ بچے تو روپیہ چراؤں۔ آخر یہی ہوا۔ ایک دن باپ باہر
گیا ہوا تھا۔ لڑکے نے کوٹھری کا کونا کھودا جہاں روپیہ دفن تھا اور
سب توڑے نکال لئے۔ اسکے بعد مٹی ڈال کر جگہ برابر کر دی۔
اب اسے یہ روپیہ اُڑانا شروع کیا۔ خوب عیاشیاں کیں اور فضول خرچی
میں سارا روپیہ برباد کر دیا۔ باپ کو ایک دن شبہ ہوا۔ اسنے لڑکے
کے اچھے کپڑوں کو دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ کہاں سے آئے۔ لڑکے
نے جھوٹ موٹ باتیں بنائیں۔ مگر باپ کو یقین نہ آیا اور کوٹھری
میں جاکر کونہ کھودا۔ تو روپیہ کی تھیلیاں غائب تھیں۔ یہ دیکھ کر اسکے

ہائے کا نعرہ مارا۔ اور کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گیا آنکھیں پتھرا گئیں۔ لڑکا یہ دیکھ کر بہت گھبرایا اور معافی مانگنے لگا اور کہا اب تو مجھ سے خطا ہوگئی آیندہ نہ ہوگی۔ باپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور کہا بازار سے حلوا خرید لاؤ۔ لڑکا گیا اور حلوا خرید لایا۔ باپ نے اپنا کرتہ اُتارا۔ اندر ایک گدڑی پہنے ہوئے تھا اُسکو اوھیڑا تو اشرفیاں نکل آئیں اسنے ان اشرفیوں کو ایک ایک کرکے حلوے میں رکھا اور نگل لیا یہاں تک کہ ساری اشرفیاں اور حلوا کھا لیا۔ اور کہا تم اس قابل نہیں ہو کہ دولت تم کو دوں۔ اسلئے میں نے سب کھا لی۔

یہ کہہ کر وہ وہیں لیٹ گیا۔ دم توڑنے لگا اور مر گیا۔ لڑکوں نے کفن کا سامان کیا اور قبرستان میں جاکر دبا آئے۔

اس بات کا چرچا سارے محلہ میں تھا۔ اور لوگ مرنے والے کنجوس پر لعنت بھیجتے تھے۔ اس محلہ میں چند کفن چور بھی رہتے تھے اُنھوں نے سنا تو دو دن کے بعد رات کو کنجوس کی قبر پر گئے تاکہ لاش کو چیر کر اشرفیاں نکال لیں۔ چنانچہ اُنھوں نے قبر کھودی اور پٹاؤ کا پتھر ہٹایا۔ کیا دیکھتے ہیں لاش پھٹی پڑی ہے اور اشرفیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ چور نے ایک اشرفی پر ہاتھ ڈالا تاکہ اسکو اُٹھائے۔ اشرفی کو ہاتھ لگانا تھا کہ یہ معلوم ہوا گویا آگ کی

چنگاری پر ہاتھ پڑا۔ بلبلا گیا۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ اور قبر سے باہر آگیا۔ مگر ہاتھ کی جلن کم نہ ہوتی تھی۔ گھر آیا تو ہاتھ کو پانی میں ڈال دیا اُسوقت ذرا کے ذرا چین آیا۔ لیکن جہاں پانی سے ہاتھ باہر نکالا پھر وہی آگ لگنے لگی۔ تین دن یہی حالت رہی۔ بہتیرے علاج معالجے کئے ایک فائدہ نہ ہوا۔ یہانتک کہ تیسرے دن ہائے جلا۔ ہائے جلا چیختا ہوا مر گیا۔

کنجوسوں اور چوروں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

بے چین مُردہ

غدر سے پہلے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس ایک مکان میں کوئی شاہ صاحب رہتے تھے۔ اس مکان کے صحن میں دہلی کے شہزادوں کا قبرستان بھی تھا۔ ایک دن کسی نوجوان شہزادہ کا جنازہ یہاں لاکر دفن کیا گیا۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ جب رات ہوئی اور میں سو گیا تو ایکا ایکی کسی کی ہائے ہائے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ آخر یہ آواز کہاں سے آئی باہر صحن کی طرف خیال کیا تو معلوم ہوا ایک سایہ سا ہے جو قبر کے چاروں طرف ڈورتا پھرتا ہے۔ اسمیں سے آواز آتی ہے۔

ہائے ہائے۔ ارے میں جلا۔ ہائے میں جلا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں میں ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ مگر دل مضبوط کر کے میں نے زور زور سے کلمہ پڑھنا شروع کیا اور کہا میاں تم بھی کلمہ پڑھو عذاب کم ہو جائے گا۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ آواز جاتی رہی۔ اور سایہ غائب ہو گیا میں لیٹ رہا اور آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی غل شور پیدا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ سایہ اسی طرح قبر کے چاروں طرف گھبرایا گھبرایا پھر رہا ہے۔ اور ہائے ہائے کی آواز آ رہی ہے۔

اب کے میری ہمت ٹوٹ گئی۔ اور خوف کے مارے بڑی دیر تک کلمہ منہ سے نہ نکلا۔ لیکن جب مُردہ کی بے چینی حد سے بڑھی تو میں نے پھر کہا کہ میاں کلمہ پڑھو۔ یہ سنتے ہی آواز خاموش اور سایہ غائب ہو گیا۔

صبح کو اس مُردے کے گھر والے پھولوں کی چادر چڑھانے آئے تو میں نے اُنسے رات کا قصہ بیان کیا۔ یہ سنتے ہی ایک بڑھیا عورت نے چیخ ماری اور رونے لگی۔ یہ اس مُردے کی ماں تھی۔ اسنے کہا مرنے والے کا سلوک میرے ساتھ اور اپنی بیوی کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ میں نے اسی وقت اس کا قصور معاف

کیا۔ اور گھر جا کر اسکی نوجوان مظلوم بیوہ سے بھی قصور معاف کرا دوگی شاید ان گناہوں کے سبب اسکی پکڑ ہوئی ہو۔ اور معاف کر دینے سے بخشا جائے اور عذاب سے چھٹکارا پائے۔

دیکھو ماں اور بیوی کو ستانے اور اُن پر ظلم کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ ڈرو اور توبہ کرو۔ تم کبھی اپنی ماں بہن بھائی بیوی بچوں کو نہ ستانا۔

اہل آسمان نے مجھ سے کہا

تو دیکھ! علاؤالدین خلجی کیسا سلطان تھا۔ وہ تمام ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ اس کی تلوار کا زور جنگلوں پہاڑوں میں مشہور تھا۔ اسکو دوسرا سکندر بننے کی ہوس تھی۔ اسکے دربار کی شان و شوکت بے مثال تھی۔

مگر آج خیال کر۔ کیا وہ کہیں ہے؟ اسکی تاجداری کا کچھ نشان ملتا ہے؟ قطب مینار کے نیچے دیکھ۔ مغربی رُخ ٹوٹے پھوٹے در و دیوار ہیں خس و خاشاک کے انبار ہیں۔ یہاں اُس سلطان کا شاندار مقبرہ تھا مگر اب قبر کا تعویذ بھی باقی نہیں[1]۔ جہاں اس عظیم الشان سلطان کی

[1] انگریزی سرکار نے اب اس مقبرہ کی مرمت کرا کے قبر کا تعویذ بھی بنوا دیا ہے جس سلطانی

لاش دفن کی گئی تھی - وہاں ایک ویران گڑھا نظر آتا ہے - اور کچھ نہیں - نہ یہاں مخملی شامیانہ ہے - نہ پہرے والے سپاہی ہیں - نہ آواز دینے والے چوبدار ہیں - گھاس کے تنکوں چونے کے کنکروں - خارا کے پتھروں میں مُردہ بدن خاک بنا پڑا ہے -

ذرا دوسری طرف نگاہ اُٹھا - غیاث الدین بلبن غلام خاندان کا مشہور شہنشاہ اور اس کا بیٹا محمد خاں شہید شکستہ مقبروں میں پڑے سوتے ہیں - انکے گورخانے بھی برباد و تباہ پڑے ہیں - اور نظر پڑتا گیارہ گیارہ میل پرانی دہلی کے کھنڈروں کو دیکھ - کیا کیا محل تھے کیسی کیسی مسجدیں و خانقاہیں تھیں - حویلیاں اور بلند عمارتیں تھیں مگر اب سب سرنگوں پڑی دم توڑ رہی ہیں -

میں نے کہا - آسمان والو - مجھ سے کیا کہتے ہو تم خود دیکھو بابل نینوا - روما - کے آثار قدیم کا انجام دیکھ چکے ہو دہلی کو بھی اس پر قیاس کر لو -

کیا تم مجھ سے کہوانا چاہتے ہو - کہ دنیا کے جاہ پرست نام نمود کے طلبگار - نئی عمارتوں کے بنانیوالے اگلے وقتوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کریں - لیکن مجھ سے نہ کہواؤ - لوح محفوظ میں دیکھو کہ وہاں کیا لکھا ہے - اسکے بعد تم بھی انتظار کرو اور میں بھی راہ دیکھوں

موت کی گھڑی

اچھا لکھنے والے لکھ چکے اچھا بولنے والے بول کر تھک گئے
دلیل اور حجت کی بارش برستی رہی۔ عقل نے بہتیرا زور لگایا۔ تلوار نے
ہر چند دھمکیاں دیں مگر لامذہب کا انکار نہ ٹوٹا۔ وہ جہاں تھا وہیں رہا
کوئی ایک ثبوت پیش کرتا لامذہب چار تردیدیں سامنے لاتا
زبان اسکی تیز قلم میں اس کے روانی۔ علم میں پورا ارادہ کا پکا۔ بھلا کس کی
مجال تھی جو اسکو قائل کرتا اور مذہب کے آگے اس کا سر جھکاتا
لامذہب جانتا تھا جس چیز کا خدا تعالیٰ نے مذہب نام رکھا ہے وہ
فطرت انسانی کی ایسی رہنمائی ہے جو آدمی کو دائرہ انسانیت میں
قائم رکھ سکے۔ مگر جب میں خود اپنے عقل و ضمیر سے اتنی تمیز رکھتا ہوں
کہ سوسائٹی اور آدمیت کے خلاف کوئی بات ہاتھ پاؤں آنکھ کان
زبان یا اعضائے ظاہری و باطنی سے نہ کروں تو پھر کیا ضرورت ہے
کہ ایک ہجوم بے عقلاں میں شریک ہوں۔ اور مذہبی آدمی کہلاؤں
کیونکہ مذہب کے پابند زیادہ تر جاہل اور بے عقل لوگ ہوتے ہیں۔
اور مذہب کے راستہ میں چلنے والے کو بیشمار مضحکہ خیز بیوقوفی کی
رسمیں بھی ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو مذہب آدمی سے

ایسی ناشائستہ حرکات جوش تعصبی میں کرادیتا ہی جو دانش اور ہوش انسانی کے سراسر منافی ہیں۔

غرض لامذہب کا انکار دن بہ دن پختہ ہوتا گیا۔ پہلے تو لوگ اسکو سمجھاتے تھے تحریری و تقریری اثر اس پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اب وہ خود دوسرے اہل مذہب کو فہمایش کرتا تھا اور عقل دلیل کے زور سے اس نے متعدد آدمیوں کو منکر مذہب بنا دیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میرا جادو چل سکتا ہی تو اس نے ایک کتاب اسلام اور عقلیت یا مذہب اور عقل کے نام سے لکھ ڈالی اور اس کو شائع کر دیا۔

کتاب کے شائع ہونے ہی توقع کے موافق اہل مذہب جوش میں آگئے۔ جہاں اس نے تعلیم پائی تھی اسکو برا بھلا کہنے لگے بعض نے نفس تعلیم کو صلواتیں سنادیں دو ایک نے عقل کے پتھر کا جواب عقلی پتھر سے دیا۔ لامذہب مسکرا مسکرا کر مزے لیتا تھا اسکو تو پہلے سے ان حرکات عجیب کا علم تھا وہ چاہتا تو اس پر ایک پیشین گوئی شائع کر سکتا تھا۔ جو بالکل ہو بہو پوری اترے۔ مگر پیشین گوئی کو بھی وہ مذہب کی ایک شاخ سمجھتا تھا۔ لہذا وہ چپکا رہا۔ اور اپنا کام کئے گیا۔

لامذہب کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شراب سے اسکو نفرت تھی زنا اور جوے کا کبھی اس نے ارادہ بھی نہیں کیا۔ دغا فریب۔ غیبت چوری۔ کے گناہ اس نے دانستہ کیا نا دانستہ بھی نہیں کئے اپنی روزی محنت سے کماتا تھا اور بڑی بے فکری اور آزادی کی خوش باش زندگی بسر کرتا تھا۔

اس کی زندگی کا پروگرام یہ تھا۔ صبح طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہوتا ورزش کرتا غسل کرکے دودھ پیتا۔ پھر ہوا خوری کو نکل جاتا واپس آکر کالج کے سبق کی کتاب دیکھتا۔ کیونکہ وہ ایک کالج کا پروفیسر تھا۔ دس بجے کھانا کھا کر کالج جاتا چار بجے واپس آکر کچھ ناشتہ کرتا اور ٹینس کھیلنے ایک کلب میں چلا جاتا وہیں اسکے ہم خیال احباب ملتے جن سے سورج چھپنے کے وقت تک خوش گپی رہتی پھر گھر آتا کھانا کھا کر کتاب دیکھتا۔ اخبار پڑھتا۔ اور پاؤں پھیلا کر آرام سے سو رہتا اسکو نماز وغیرہ کی پابندی جیل نظر آتی تھی۔ وہ کہتا تھا وقت کی پابندی کام کے لئے ضروری ہے۔ اس کام کی کیا ضرورت ہے جس کا نتیجہ کچھ نہیں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جاتا ہے۔

وہ بہت فیاض تھا۔ اکثر اپنے حصہ کا کھانا کوئی بیکس محتاج سامنے آجاتا تو اس کو دیدیتا تھا مگر روزہ پر اس کو حیرت تھی کہ خلقت بھوکی

کیوں مرتی ہے۔

اُس کی آمدنی اتنی تھی کہ ذاتی ضروریات سے روپیے بچ رہتے تھے۔ اُن کو وہ طالب علموں یا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا مگر زکوٰۃ کے ٹیکس کو وہ فضول سمجھتا تھا کیونکہ اس کو مذہبی قواعد کے ماتحت رہ کر خیرات کرنے سے چڑ تھی۔

لامذہب پروفیسر میں ایک متقی مسلمان کے اوصاف سب موجود تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کا عقیدہ مذہب اور اس کے خدا پر نہ تھا۔ اس کا خیال تھا خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ فطرت کے تقاضے سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور شکل بدل کر مٹ جاتی ہیں

اگرچہ وہ مسلمانی مذہب کا منکر تھا مگر مسلمان قوم پر اس کی جان فدا تھی۔ کیا مجال کہ مسلمانوں کی کہیں توہین ہوتی ہو اور وہ برداشت کرے مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ وہ سرحدی جوان تھا۔ ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے دس پانچ کیا سو پچاس آدمیوں کی ہیبت اس پر ذرہ کے برابر بھی اثر نہ کرتی تھی۔

لامذہب پروفیسر کو شادی کی رسمیں معلوم کرنے کا بڑا شوق تھا ہر قوم کی رسومات شادی سنتا موقع بنتا تو خود جا کر دیکھتا کوئی کتاب ایسی ملتی تو بار بار پڑھتا۔ اور مراسم کو یاد کر کے لوگوں کو سناتا۔

یہ سُن چکے ہو کہ لامذہب پروفیسر بہت توانا اور تندرست نوجوان تھا پاکبازی کے سبب اسکی صحت جسمانی بہت اچھی حالت پر قائم تھی اور وہ یقین کرتا تھا کہ طبعی عمر سے پہلے اس کو موت نہیں آئے گی۔ یہ یقین اہل مذہب کے ایمان کی طرح مضبوط تھا۔ اور کوئی چیز اس کے خیال عقلی کو بدلنے والی موجود نہ تھی۔

لیکن یکایک وہ بیمار ہوا۔ اور ایسا کہ باوجود جسمی قوت کے بستر سے اُٹھنا دوبھر ہو گیا۔ اس کے دوستوں نے ڈاکٹروں کا جم غفیر جمع کر دیا جنہوں نے بہت توجہ سے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ اور پھر علاج شروع کیا۔ ڈاکٹروں نے مرض کے جو اسباب تجویز کئے ان کو پروفیسر نے تسلیم کیا اور اُسے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹھیک راستے پر پہنچے ہیں اور اب مرض کے دفعیہ میں اُنکی کامیابی یقینی ہے۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ دوا بتائی اُس نے ٹھیک اصول کے موافق اُن کو استعمال کیا اور پرہیز بھی ایسا کیا جو پرہیز کا حق تھا۔ یعنی ڈاکٹری مشورہ سے ایک انچہ ادہر اُدہر نہ ہوا۔

مگر پروفیسر حیران تھا کہ دوا اثر کیوں نہیں کرتی مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور کوئی تدبیر اس کو روک نہیں سکتی۔ اس نے بار بار ڈاکٹر تبدیل کرائے لیکن کسی سے مرض کی روک تھام نہ ہو سکی۔

وہ یونانی علاج کا قائل نہ تھا مگر مجبور ہو کر چند اچھے طبیب بھی ملائے اُن کی تجویز بھی ڈاکٹروں کے موافق ہوئی مگر دوا پی تو اس کا اثر یہاں بھی ندارد آخر ڈاکٹروں اور طبیبوں نے جواب دیدیا احباب کو نہیں خود پروفیسر کو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پروفیسر ڈرنیوالا آدمی نہیں ہے پروفیسر نے اس فیصلہ کو بہت اطمینان سے سنا اسکی نسل موت سے کبھی نہیں ڈرتی کجا عقل و فلسفہ سے اس کے دماغ کی پرورش ہوئی تھی اور وہ موت کو زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ سمجھا تھا۔

اس واسطے اس نے ڈاکٹری رائے کی کچھ پروا نہ کی۔ اور اطلاع مرگ سے ہوش باطنی اور حواس ظاہری کو پراگندہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ پروفیسر کے اعصاب دل و دماغ ہی نے اس خبر کو زیادہ اہم نہیں سمجھا تھا۔

مگر اسکے ساتھ ہی وہ اپنے قوائے حفظ ماتقدم پر بار بار زور ڈالتا تھا اور سوچتا تھا کہ میرا مرض ان امراض میں نہیں ہے جن کا علاج ڈاکٹروں کو معلوم نہیں معمولی بیماری ہے جسکی حقیقت سے اور اسکی دوا سے میں خود اناڑی آدمی تک واقف ہوں پھر کیا وجہ ہے جو دوا اپنا اثر نہیں کرتی۔ مجھے آخر دم تک تدابیر اور کوشش سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ نیچر کا فیصلہ نہیں ہے آدمی کی رائے

میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بشریت سے سب ڈاکٹروں کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔

یہ خیال کرتے ہی اس کے دل کو ایک ہکا سا لگا۔ اس کا ضمیر خود بخود نادم سا ہو گیا۔ کیونکہ اس خیال کی لہر کے ساتھ دوسرے گوشہ خیال سے یہ موج پیدا ہوئی تھی کہ اسی طرح خدا کے وجود کو نہ ماننے میں ممکن ہے میری بشری بھول ہو اور مرض کو لاعلاج خدا ہی نے کر دیا ہو تاکہ وہ میرے انکار مذہب کو زک پہنچائے۔ اس خیالی جبتی نے پروفیسر کو کچھ گھبرا سا دیا۔ اسکے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ دل کی حرکت تیز ہو گئی مگر فوراً ایک تیسرے خیال نے اسکے اوسان درست کر دیے جو یہ تھا۔

ہر انسان میں قدرتی طور پر لیاقت اور نالائقی۔ قوت اور کمزوری ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ اگر علم و تربیت سے لیاقت اور طاقت کو سہارا ملا تو وہ نالائقی اور کمزوری پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسان پر غلبہ نالائقی اور کمزوری کا ہو جاتا ہے۔ چونکہ میری تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہے میں اپنی کمزوریوں پر غالب تھا۔ مگر اب بیماری کے سبب اعضائے دماغی ناتوان ہو گئے ہیں اسواسطے عقیدہ کی کمزوری ابھرتی ہے اور مجھکو خدا اور مذہب کی حقانیت کا وہم دلاتی ہے۔ پس مجھے بچتہ ہونا چاہیئے اور دنیا سے چلتے وقت ایسی بے عقلی کی حرکت سے اپنے کیریکٹر کو گندہ

نہ کرنا چاہیئے۔

اس خیالی موج نے پروفیسر کے بحر قلب کا وہ بلبلا توڑ ڈالا جسمیں ابھی ساری عمر کے بعد تصوّر خدا کی ہوا سمائی تھی۔ اور وہ ہمہ تن صاف سینہ ہو کر پھر اپنے مرض پر غور کرنے لگا۔

سکرات کا آلارم

افسوس اجل نے پروفیسر کو مزید غور و فکر کی مہلت نہ دی اور اپنی آمد کا گھنٹہ بجانا شروع کر دیا۔

پروفیسر نے بہت کم موت کا فلسفہ پڑھا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی جوان تھا اور اس وقت کی تیاری کو ضروری نہ سمجھتا تھا۔ نہ اس نے اور لوگوں کے مرنے میں کبھی شرکت کی تھی۔ جو مرنے کی حالت سے واقف ہوتا اس واسطے موت کی آمد کا اصلی نشان اس کو معلوم نہ تھا تاہم وقت آخر کی جسمانی کوفت سے اس نے سمجھا کہ یہ کیفیت مرض کی تکلیف سے کچھ الگ سی ہے۔ شاید کچھ پیش آنیوالا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹروں کی رائے کے موافق موت آئی ہو۔ اگر موت آتی ہے تو اور اگر مذہب والے سچے ہیں۔ اور اگر موت کے وقت فرشتے آیا کرتے ہیں تو وہ کہاں ہیں مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سب فرضی کہانیاں تھیں۔ یا شاید مجھے

موت ہی نہ آئی ہو۔ موت نہیں آئی تو فرشتے کیونکر آتے۔

پروفیسر اپنے خیال پر جھنجلایا کہ گھڑی گھڑی خداوند مذہب کا دھیان کیوں آتا ہے۔ موت آئی ہے تو میں خوشی سے زندگی دینے کو تیار ہوں پر احمق پن کے خیالات میں جان کیوں دوں۔

اِسی کشمکش میں تلوؤں میں کسی نے بجلی کی مشین لگا دی۔ جس سے بدن کے پٹھے اکڑنے لگے اور پروفیسر کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ وہ تڑپنا چاہتا تھا مگر تڑپ نہ سکتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اسکی آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ پیروں کے سمیٹنے کی خواہش میں تمام جسم کی قوت خرچ کر رہا تھا مگر پاؤں ہلتے تک نہ تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پاؤں سامنے پھیلے ہوئے ہیں لیکن اسکے ارادہ سے اوپر کو نہیں سمٹتے۔ زبان کا حس معلوم ہوتا تھا کہ وہ منہ کے اندر موجود ہی مگر وہ بولنے سے گویا انکار کرتی تھی۔ پروفیسر نے اس بے اختیاری سے ہراساں ہو کر پلنگ کے آس پاس اپنے احباب کو دیکھا لیکن کسی دوست نے اس کے مطلب کو نہ سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی فریاد اُن سے کرے۔ کسی کی مخالفت بھی نہ تھی۔ کوئی روکنے والا نہ تھا مگر زبان پر قفل لگ گیا تھا اور اسی بات سے پروفیسر زیادہ کھسیانا اور مایوس تھا۔

بجلی کی مشین موجود نہ تھی مگر پروفیسر کو معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اس کے

पुस्तकालय

پیروں پر [illegible]گی ہوئی ہے جو اسکی رگوں اور پٹھوں کو کھینچ کھینچ کر توڑ
ڈالتی ہے اسے معلوم ہوا کہ دماغ نشتر سے چیرا جاتا ہی اور میں دماغ کے
اندر آباد ہوں۔ اس واسطے اس نے پھر کوشش کی۔ اور پکار پکار کر
کہنا شروع کیا اس گھر کے اندر میں ہوں۔ اس کو نہ توڑنا۔ اس کو نہ
چیرنا۔ مگر اسکی چیخ پکار سے اس کو تسلی نہ ہوئی۔ اس واسطے اس نے
خیال کیا کہ میری آواز شاید کسی نے بھی نہیں سنی۔ ہائے میں کیسا
بے کس ہو گیا ہوں۔

اب اسے معلوم ہوا کہ میں شاید ہزاروں کوس اونچے مینار سے
نیچے گر رہا ہوں۔ اور نیچے گرتے وقت کلیجہ میں جو ایک سناٹا سا ہوتا ہی
اس کا حس پروفیسر کو بہت تیزی سے محسوس ہونے لگا۔

پھر معلوم ہوا کہ دل میں ایک دریا ہی میں مینار پر سے اسکے اندر گر پڑا
بہت دیر تک تو دریا کی تہ میں ڈبکیاں کھاتا رہا آخر اوپر ابھرا۔ اور پانی
سے گردن باہر نکالی۔

گردن نکلنی تھی کہ اسکو یہ معلوم ہوا کہ میں نے خواب دیکھا ہی پلنگ پر
لیٹا تھا۔ دوست چاروں طرف بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر آلہ سے دل کی حرکت
دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے ڈاکٹر سے کہا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز ہی جو میری
زندگی کو موت کے ہاتھ سے بچا لے۔ ڈاکٹر کوئی خدا پرست آدمی تھا

بولا سوائے خدا کے کسی میں یہ طاقت نہیں۔

پروفیسر اس چیز کا نام مت لو کیا ایسے عقل اور سائنس کے زمانہ میں۔ انسان جیسی ہستی موت کو روکنے سے عاجز ہے تو کیا تاریک اور وحشی زمانہ کا خدا اس وقت میں بھی ہم لوگوں پر کچھ اقتدار رکھتا ہے۔

یورپ و امریکہ نے بڑی بھول کی جو اسباب حیات کے لئے آلات سامنے میں مصروف ہو گئے آسایش جسمانی کی ترقیوں کیلئے انھوں نے اپنی عقلوں کو خرچ کیا۔ کاش وہ سب کے سب موت کی حقیقت معلوم کرلیں۔ کاش وہ اتنا سمجھ لیتے کہ تھوڑی دیر کے واسطے موت کیونکر رک سکتی ہے۔ آہ میں زندہ رہ سکوں تو ساری زندگی اسی دریافت میں خرچ کردوں گا۔ ارے کوئی تو ایسا آئے جو مجھے اس وقت مرنے نہ دے۔ کوئی تدبیر تو ایسی نکالو کہ موت مجھکو مہلت دیدے۔

ہائے یہ کیموڈ کے درخت کیسے زندگی میں آزاد کھڑے ہیں اور میں انکا مالک۔ جان دے رہا ہوں۔ یہ میرے کرسیاں موجود رہیں اور میرا وجود فنا ہو جائے اس بنگلہ کی یہ تختی میرا ساتھ نہیں دیتی۔ زندگی میں یہ مجھکو دھوپ اور بارش سے بچاتی تھی۔ میری کتابیں الماری میں خاموش رکھی ہیں وہ بھی کچھ نہیں بولتیں۔

میں آدمی ہوں عقل کا پتلا ہوں۔ کیا ایسی عاجزی اور لاچاری کا وقت بھی پیش آنے والا تھا جس کا علاج میرے پاس نہیں۔

یہ کہتے کہتے پھر بجلی اسکے پیروں میں لگائی گئی۔ اور پہلی سی تکلیف اسکو ہونے لگی۔

اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وحشتی ایام کے خدا سے مدد مانگوں گا۔ اسکا اقرار کروں گا۔ بیشک وہ ہی اسکے خیال کرنے سے مجکو تسلی ہوتی ہی۔ مجھے حضرت علیؑ کا قول یاد ہی کہ اگر موت کے بعد کچھ نہیں ہی تو خدا پرست اور منکرین خدا کی یکساں حالت ہی اور اگر کوئی دوسرا عالم مرنے کے بعد ہی تو خدا پرست فائدے میں ہیں اور منکر گھاٹے میں۔ بیشک علیؑ کا فلسفہ سچا ہی خدا کے اقرار میں لذت ہی اور اسکے انکار میں بیکسی و مایوسی وہ ضرور موجود ہی۔ نہ ہوتا تو انسان اس وقت مجبور کا چارۂ کار ضرور پیدا کر لیتا وہی نہیں کرنے دیتا۔ اُسی نے دواؤں کو بے اثر کر دیا۔ وہی عقل کو مغلوب کر رہا ہی۔

اے خدا نو جہاں ہی میری سُن میں تجکو تسلیم کرتا ہوں میں تیرا اقرار کرتا ہوں میں اپنے نام محمد ظریف کے پہلے حصہ کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ محمدؐ تیرا فرستادہ تھا۔ میری عقل کا سلام اُس کو پہنچا۔ اور اس بیچینی میں میرا سہارا بن موت سے بچا لے۔ یا اسکی دشواری کو آسان کر۔

یہ کہتے ہی پروفیسر کے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی - تکلیف جاتی رہی اور ایک طرح کی لذت کا اثر اسکو محسوس ہوا جسم کے رونگٹوں سے کوئی چیز نکلتی معلوم ہوئی - آنکھوں پر نیند کا سا غلبہ ہوا - اور ایک ہچکولا ایسا لگا کہ پروفیسر نیند سے چونکتا سا رہ گیا اور پھر اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں ہے - کیسا ہے - کیا تھا کہاں تھا - اور اب کہاں چلا گیا -

---

جناب مولانا راشد الخیری عم آدا دہلی کے مشہور انشا پرداز ہیں زنانہ رسالہ عصمت کے ایڈیٹر اور متعدد رسالہ کتب کے مصنف ہیں - انکی عبارت ایک مخصوص رنگ کی ہوتی ہے خصوصاً مصائب عم لکھنے میں انکو کمال حاصل ہے - شمس العلماء مولانا مدیر احمد دہلوی سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے مگر ادب اردو میں انہوں نے مولانا مرحوم سے جداگانہ ایک شاہراہ ایجاد کی ہے -

مجھے رسالہ کم ٹوموت لکھتے وقت خیال آیا کہ مولانا ممدوح کے چند مصائب بھی اس کتاب میں شریک کئے جائیں - مگر وہ میری طرح لکھنے کی مشین نہیں بہت کم لکھتے ہیں اور مشاقی سے لکھتے ہیں اسلئے معذور ہوں کہ انہوں نے میری درخواست رد نہیں کی اور اس رسالہ کم ٹوموت کے لئے چند مصائب بہت جلدی تیار کر کے دیدیئے جو ناظرین کی خدمت میں حاضر کئے جاتے ہیں پڑھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ مولانا عم آدا نے ہر مضمون میں موت کا وقت مجسم کر کے

کھڑا کر دیا ہے اور اس میں انکی انسایرداری کے لاجواب کمالات کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔
خدا کا شکر ہے کہ رسالہ کم ٹو موت کا مقصد اس جدید اضافہ سے دوگنا روشن
ہوگیا اور اہل ملک نے مختلف طرحوں کے وقت آخر کو الفاظ کے لقشہ میں سامنے
موجود دیکھ لیا اور یہی وہ چیز ہے جسکی خاطر میں نے یہ رسالہ مرتب کیا ہے۔

حسن نظامی

اکلوتہ کی موت

زندگی ہستی تھی اسرائیلی خاندان کے اُن چند افراد پر جن کو موت سے
کدورت نفرت عداوت خدا معلوم کیا تھا کہ مری ہوئی چیونٹی تک کا
ذکر گھر میں نہ آسکتا تھا۔ عورتیں تو خیر جاہل کم عقل دہمن جو کچھ بھی
تھیں مگر رونا ان کمبخت مردوں کا ہے پڑھے لکھے سمجھدار دوراندیش
اور پھر یہ بھی نہیں کہ سب کو عمر جوان دو برس کے بچہ سے لیکر
پینسٹھ برس تک کے بڈھے پھونس موجود مگر کیا مجال جو ٹروں
تک میں موت کا نام آجائے۔ عورتوں نے تو خیر یہی انتظام
کیا تھا کہ اگر کسی ماما نے مرا ہوا چوہا دیکھ لیا تو تین دن گھر میں قدم
نہ رکھے مگر مرد بھی عورتوں سے کسی طرح ہیٹے نہ تھے نواب ولی محمد
خاں کا تعلقہ کچھ نہیں تو ایک چھ ہزار روپیہ ماہوار کا ہوگا خدا

جھوٹ نہ بلائے منشی محرر کارندے خزانچی نوکر چاکر یہ ۸۰ سب
ملا کر کوئی سو آدمیوں کا عملہ تھا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ موت
کا نام لے سکتا بنا ملازم اِدہر نام لکھا گیا اور اُدہر اُس خاص داروغہ
نے جو اسی کام کی تنخواہ پاتا تھا صاف صاف کہدیا کہ دنیا بھر کے
قصور کیجیو مگر موت کا نام کبھی نہ لیجیو اسند ضرورت ہو تو موت کو
پیدایش کہدیا جائز ہے مگر یہ نام جس کی زبان سے نکلا اُس کا
پھر ٹھکانا نہیں ولی محمد بیوقوف شخص نہ تھا قومی کاموں میں اس کے
چندے مہمانوں کی خاطر مدارات حاجتمندوں سے اسکی ہمدردی
عام طور پر مشہور تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ موت سے اسے ایسی کیا
دشمنی تھی کہ اگر اس کا بس چلتا تو ملک الموت کو کچا کھا جاتا دشمنی بھی
نہیں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ قدرت کی تمام کائنات بیگناہ
قیدیوں کی حراست دکھیاری رانڈوں کا رمانہ بیوگی سیکس ایاہجوں کا
عرصہ حیات ہر چیز دنیا میں قائم رہے مگر موت کا وجود نہ رہے
اتفاق سے نواب ضمیر الدولہ بہادر شکار کی غرض سے تشریف
لائے ولی محمد کے قدیمی دوست تھے جی کھول کر خاطر مدارات کی
ناچ رنگ کھیل کود ہیجڑے بھانڈ رنڈیاں میراسنیں کوئی فرحت
ظاہری ایسی نہ تھی جو نظر انداز کی گئی ہو ولی محمد خاں ایک روز

محلسرا میں تھے اور ضمیر الدولہ بہادر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ وزیر ایک نیا نوکر جس کو آئے دو دن بھی نہ ہوئے تھے اور آقا کی صورت تک نہ دیکھی تھی دفعتہً گھبرایا ہوا آیا اور ضمیر الدولہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہانپ رہا تھا آنکھ میں آنسو تھے دل کا اللہ مالک تھا۔

ضمیر الدولہ۔ کیا ہے؟

وزیر۔ حضور! کیا عرض کروں! والد پیدا ہو گئے۔

ضمیر الدولہ۔ تمہارے ہاں والد پیدا ہوئے، کب؟

وزیر روگر۔ سرکار ابھی تھوڑی سی دیر ہوئی۔

ضمیر الدولہ۔ والدہ بھی پیدا ہوئیں یا ابھی نہیں۔

وزیر۔ اجی سرکار والدہ کو پیدا ہوئے تو چار برس ہوئے۔

ضمیر الدولہ۔ تو اب چار برس کی ہیں اور تمہارے ہاں کون کون پیدا ہو چکا ہے۔

وزیر۔ غریب پرور کس کس کو گنواؤں، دو بھائی پیدا ہوئے تین بہنیں پیدا ہوئیں اب ایک میں رہ گیا ہوں سو اب میں بھی صبح شام میں پیدا ہونے والا ہوں۔

ضمیر الدولہ۔ پیدا ہوتے ہی گوند کھانے بھی اڑاؤ گے یا نہیں

وزیر واہ سرکار کسی کے ہاں پیدایش ہو اور آپ مذاق اڑائیں

ضمیر الدولہ۔ تو کیا پیدائش رونے کا وقت ہے
ضمیر الدولہ بہادر نے اتنی دیر مغز مارا اور خاک نہ سمجھ سکے کہ وزیر کا
مطلب ہے کیا اتنے ہی میں ولی محمد خاں بھی آ گئے سنتے ہی
تیوری پر بل آگیا چہرہ بدل گیا کیا ہے، کیوں ایسے لوگ نوکر رکھے
جاتے ہیں جنکو ایسی ضرورتیں پیش آئیں بلاؤ داروغہ کو، بیوقوف
کچھ نہیں سمجھتا کیوں ہیں پہلے سے اچھی طرح دیکھ لیتا سخت تکلیف
ہوئی حد سے زیادہ ازیت نامعقول مالایق چلو ہٹو سامنے سے
بھاگ جاؤ پھر کبھی مت آؤ۔
نواب ولی محمد خاں کی عمر کا سرمایہ اور سنگم صاحب کی [illegible]
ایک پانچ برس کا بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی باپ بن چکا تھا اور [illegible]
نام تھا ابو العلا نواب ظہیر بھی حال یہ بچہ ماں کی طرف سے چار بہنوں
میں اور باپ کی طرف سے پانچ بھائیوں میں صرف اکیلا [illegible]
سچ مچ کی نعمت تھا کہ جس خاندان میں چالیس سال تک [illegible]
بچہ نہ دکھائی دے وہاں ابو العلا جو کچھ نہ ہوتا [illegible]
بچہ فقیر کا نہیں عزت کا نہیں [illegible]
تارا تھا کہ دو خالائیں اپنے اپنے گھر [illegible]
آندھی ہو یا مینہ صبح اسکے واسطے آئیں اور [illegible]

اسکے کارن میاں کو بھی چھوڑ بیٹھی دن رات بچہ تھا اور وہ تھی لاڈلے
اور ملاخی ضدی اور مرت بیاہی سب ہی قسم کے سچے دیکھے مگر یہ
رنگ دیکھا نہ سُنا کہ بچہ حاصا اچھا بھلا جیگا پڑا سو رہا ہے اور اکثر ما
اور خالائیں کبھی کبھی باپ اور چچا بھی اسکے پاس بیٹھے اسکا چہرہ
دیکھ رہے ہیں کوئی ناک کی تعریف کر رہا ہے کوئی آنکھ کی کسی نے
ہاتھ سہلائے شروع کئے کسی نے پاؤں۔ ادھر بچہ نے آنکھ کھولی
ادھر چاروں طرف سے انّاؤں ماماؤں کی نو ماری بھی نہ آئی
ماما، خالہ باپ چچا بیٹا بانہ پکڑے کسی نے گود میں اُٹھا لیا کسی نے
ہاتھ سہلائے کسی نے پاؤں۔

پانچ برس کے بعد پانچ چھ برس اور آنکھ بند کر کے گذر گئے ظہیر
کی عمر اب گیارہ برس کے قریب تھی خاندان کے ہر متنفس کی آنکھیں
اسپر لگی ہوئی تھیں اور زندگی کا یہ عاشق خاندان جو بھول کر بھی موت
کا خیال نہ کرتا تھا اپنی عمر میں دن عید رات شبرات بسر کر رہا تھا
بارہویں سالگرہ قریب آئی تو دھوم دھام کی شادی تجویز ہوئی دور
دور سے مہمان آنے شروع ہوئے ہزاروں من کھانا تیار ہوا محلسرا
اور دیوانخانہ ایسا سجا کہ منہ سے بول اُٹھا مشہور گویّوں اور حسین
طائفوں کا ہار بندھ گیا سات دن کی مہمانداری اور کہنے کو عام دعوت

تھی مگر کھانے والوں کا طبقہ خاص تھا یہ نہیں کہ غریب غربا لنگڑے
لولے جسکا جی چاہے دسترخوان پر جا بیٹھے یا نحویں دن سلامی
تھی جسمیں لڑکا دولہا بنکر سارے شہر میں پھرنا اور بڑی دادی جان
کے سلام کو جانا پھولوں کا گہنا اس طرح سیار ہوا کہ اڑوس پڑوس کے
تمام باغ خالی ہو گئے دولہا سلامی کو چڑھا اذ اسکے جلو میں بیسیوں
ہاتھی سیکڑوں گھوڑے ہزاروں چوبدار حاضر تھے ولی محمد خاں اپنے
تزک و احتشام کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے اور سچ کو دیکھ دیکھ کر
باچھیں کھلی جاتی تھیں انکی نگاہ میں اسوقت دنیا دما دما ہر شے
ہیچ تھی اور انکا خیال بادی النظر میں غلط بھی نہ تھا دولت اعزاز
صحت بیفکری کونسی نعمت تھی جو میسر نہ تھی رنج انکے خیال میں
بھی نہ پھٹک سکتا تھا اور تکلیف انکے ذہن میں بھی نہ آسکتی تھی دولہا
گھوڑے سے اتر سلام کو گیا گیارہ ہزار روپیہ سلامی ملی نقارہ پر چوٹ
لگی ولی محمد خاں کو پان کا بیڑا ملا وہ ہنستا ہنساتا نوکر چاکر اچھلتے
کودتے عزیز اقارب شادماں فرحاں گھر چلے آدھی دور رستہ طے کیا
ہوگا ایک بڑھیا عورت نواب ولی محمد خاں کے سامنے آئی اور کہا
نواب! تیرے دولہا کی عمر دراز، تین وقت کی بھوکی ہوں،
اس مالک کے نام پر، جسنے یہ دن دکھایا، دکھیاری کا پیٹ بھر دے

تیرا لال جیئے، ہراری عمر، مجھ پر بھی رحم کر،
ہٹ برے، آگے بڑھ، ہٹ، چل رستہ دے، ہتّیا دینے
نکلی ہے، بھاگ۔
اہاہاہا، اجیا، حفا نہ ہو، غلطی کی، معاف کر۔
صبح علی الصباح ظہیر کو دولہا بنانیکی تیاریاں ہو رہی تھیں بہنیں بھاوجیں
بھوپٹیاں سیگ پر اڑی ہوئی تھیں آج شادی کا آخری روز اور جشن
سالگرہ کا خاتمہ تھا دودھ سے غسل دیا گیا عطر کے کسٹر لڑھا سے گئے زینت
کی آنکھیں کا پہلا بٹن ہوئی لگا رہی تھیں کہ موذّن نے صبح کے سہانے
وقت میں دنیا والوں کو ایک زبردست طاقت والے کا پیام یوں سنایا
پرندا اسکی عظمت کا ذکر سنتے ہی تسبیح میں مصروف ہو گئے درخت جھوم
جھوم کر نعرہ توحید لگانے لگے مگر عقلت کا پردہ تھا تو انسان اور اسرائیلی
عادان پر موذّن کا جھجوڑنا بیکار چڑیوں کی حمد بے سود اور درختوں کا سجدہ
فضول تھا وہی رنگ رلیاں اور وہی جہل پہل صبح ختم ہوئی وقت
گذر گیا زروجواہر دولہا پر نچھاور ہو کر عزیزوں کو نیگ ملے نوکروں کو
انعام بچّہ ماں کے سلام کو آرہا تھا کہ طبیعت نے مالش کی قے ہوئی دست
آئے اور اس غضب کے کہ دو کی گنتی تھی نہ چار کی تار بندھ گیا دو پہر
تک تو نڈھال ہو کر پلنگ سے اُٹھنے کے قابل نہ تھا ولی محمد خاں

بیگم صاحب حالائیں حجاب پریشان ہو گئے ڈاکٹر بھی آئے حکیم
بھی ملا بھی اور سیانے بھی مگر ظہیر کی حالت نہ سنبھلنی تھی نہ سنبھلی موت
کے آثار تمام جسم پر ظاہر ہو گئے ناخن نیلے ہو گئے آنکھیں بیٹھ گئیں اور
جس چہرہ کو دیکھ دیکھ کر ماں باپ ہمیشہ ناز کرتے تھے چشم زدن میں اسیر
مردنی چھا گئی شادی کا گھر موت کی محفل ہو گیا چاروں طرف لوگ خاموش
سناٹے میں بیٹھے تھے کہ بچہ گھبرا کر اٹھا برابر میں ماں بیتاب ہو کر اسکی
گردن میں ہاتھ ڈالکر کہا

اماں جان! اب تکلیف نہیں اٹھائی باقی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی پسلیاں
کلی پڑتی ہیں دعا کرو کہ موت اس تکلیف کو ختم کر دے۔

نوح لوح خدا نخواستہ خدا نخواستہ دشمن دشمن

ایک متعفن آواز گونجی مگر ماں کا کلیجہ بچے کی اس تکلیف سے نکل پڑا وہ فرط
محبت میں لپٹ گئی منہ پر منہ رکھ دیا باپ کی آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں
بہہ رہی تھیں غمناک آنکھیں اسکی صورت کو دیکھتی تھیں اور روتی تھیں
اب اللہ ولی محمد کو یہ خیال آیا کہ اگر موت اس لال کو مجھ سے جدا کر گئی
تو کیا کروں اس خیال سے آہ ہی بے اختیار ہو گیا اور جوش محبت میں
اسکے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اس وقت ظہیر بیہوش ہو چکا
تھا اور ہیضہ کی آخری منزل سخت شروع تھا خالائیں سر پیٹ رہی تھیں

چیخا دیواروں سے ٹکریں مار رہے تھے ماگم سم اور باپ سکتہ تھا دونو کی آنکھیں اس بارہ سال کے مہمان بچہ پر لگی ہوئی تھیں جسکو اپنا سمجھتے تھے وہ عمر کی ملکیت تھا جسکے نام سے گھبراتے تھے وہ آسوالی اٹل اور جس کا نام ملک لیبا کو ارا تھا اسکی طاقت لازوال تھی۔

دفعتہً ظہیر نے آنکھ کھولی جدل سا چہرہ کملا چکا لہا زباں اور ہونٹ خشک تھے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو چکی تھی اور جس پر ہزاروں روپیہ حالی جوتیوں کے واسطے قربان ہو رہا تھا وہ پانی کے ایک گھونٹ کا محتاج ہوا مارے پیاس کے لہا زباں سے کہا مگر موت بس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی جاک نہ سمجھ سکے اس وقت ظہیر نے حسرت بھری نظروں سے ماکو دیکھا آنسو بہہ رہے تھے زبان باہر نکال کر ماکو دکھائی اور بہ مشکل ہاتھ اُٹھا کر جوڑے اور پانی مانگا بیتاب ہو گئی اسکے ہاتھوں کو بوسہ دیا اسکے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھے کہا۔

"میں اپنے لال کے لئے پانی لائی"

ماپانی پینے گئی مگر اسکے منہ موڑتے ہی ظہیر کو ہچکی آئی اور وہ پانی کو ترستا شربت کو پھڑکتا دنیا سے رخصت ہو گیا

ظہیر کی موت ہر ان لوگوں کا کیا حشر ہوا ظاہر ہے دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی ماں اور باپ دونو سر پھوڑ رہے تھے لیکن ظہیر کی موت آنکھ سے سبق دیگئی

ہر حالت میں تغیر اور ہر صورت میں انقلاب انسانی زندگی کا لازمہ ہے
موت سر پر کھڑی ہے زندگی کے فانی تعلقات کو آناً فاناً ختم کر دیگی
تمول میں افلاس صحت میں علالت جوانی میں بڑھاپا اور زندگی میں
موت سے غافل ہونا شیوۂ انسانیت نہیں۔

اے انسان کس شے پر پھولا اور کس ہستی پر پھولا تیری طاقت
ختم ہونے والی اور تیری زندگی مٹ جانے والی ابدی طاقت اور ازلی
زندگی اس ہی ایک ہستی کی ہے جو سب سے بہتر اور سب سے طاقتور ہے۔

پیر کی موت

رسی منی دیوتا اوتار، ولی ی پیر پیمبر، دنیا ان پاک نفوس سے کبھی خالی
نہ رہی اور جب تک ہے رہیگی بھی نہیں، مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ
پیغمبری ختم ہو گئی، یعنی وحی کا آنا بند ہو گیا مگر ہی آخر الزماں کے بعد وہ
نیک بندے یقیناً آتے رہے اور چلے گئے جو رسول نہ تھے مگر عاشق
رسول بلکہ فنا فی الرسول، لیکن زندگی کے شیدا، لذتوں کے عاشق،
عیش کے دلدادہ، ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے، وہ دس تھے تو یہ
دس لاکھ بلکہ دس کروڑ، حواہش زر کا سراری کا لازمی نتیجہ تھی حصول
مقاصد کا بہترین ذریعہ لباس فقر، نتیجہ یہ ہوا، اور کچھ غلط نہ ہوا کہ کھوٹے

اور کھرے بد اور نیک جھوٹے اور سچے بُرے اور اچھے خلط ملط ہو کر سب
ایک ہو گئے لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں جلال شاہ خاک
حسین آباد سے ایک ایسا شخص اُٹھا جسنے دنیا کو دکھا دیا کہ شریعت اور
طریقت تصوف اور توحید عشق اور محبت مجازی اور حقیقی اگر نیت بخیر
اور ایمان سالم ہے تو سب ایک ہیں یہ بیچیدار گھاٹیاں خطرناک مسافت
کٹھن منزلیں فقط دیکھنے میں ٹیڑھی اور سیدھی ہیں ورنہ منزل مقصود
ایک یہ اس سے آسان وہ اس سے بشرطیکہ عزم مصمم ہمت پوری
دل صاف اور خیال پاک ہو۔

شریعت اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ ایک ہی واحد کی گوشت
اور وہ کوشش جسمیں کوئی ہاتھ تک بٹانیوالا نہیں ایسی کامیاب ہوئی
کہ آج صرف ہندوستان میں سات کروڑ کے قریب انسان اس کا
کلمہ پڑھ رہے ہیں نہ اس سے گریز ہو سکتا ہے کہ اب ہر صوبہ ہر شہر ہر گاؤں
مختصر یہ کہ ہر گھر میں ایک لیڈر ٹری موچھوں والا لمبی لمبی ڈاڑھی
والا ماتھے پر گٹے والا ڈھیلے ڈھالے کرتہ والا موجود ہے مگر

آج کل وہ جنھیں اسلام کا دعوی ہے کمال — دیکھتا ہوں میں اسے ذوق یہ انکا حال
جس طرح ہر کہ پھنسا دینے کو بے دینوں کے — نقل کرتا ہو مسلمانوں کی کافر لعال

بہر حال جلال شاہ وہ شخص تھا کہ مسلمان اس پر ہنستے اور وہ ان پر روتا

تعلیم یافتہ اس کا مضحکہ اُڑانے اور وہ ان کو دعا دینا دوست دشمن
مرید اجنبی اسکی نگاہ میں سب ایک تھے بے نفس انسان اور بے نیّت کا
آدمی تھا کہ حاسد بل جل کر اور بھن بھن کر مہر پر گالیاں دیتے بُرا بھلا کہتے
توہین کرتے تحقیر کرتے مرید ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر ہاتھ جوڑتے پاؤں
چومتے خدمت کرتے اطاعت کرتے مگر نہ اس سے تیوری پر بل آیا نہ
اس سے چہرہ پر تارگی

جلال شاہ کے پیر مولانا معصوم اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ قندھاری تھے ان کے
وصال کے بعد خلیفۂ اول جلال شاہ ہوئے اور حق الامر یہ ہے کہ گو بہت سے
باکمال عقیدت مند مولانا کے موجود تھے اور خلافت کی اہلیت رکھتے تھے
مگر جلال شاہ کو کوئی نہ پہنچ سکتا تھا۔

شروع ہی سے جلال شاہ کو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تزک احتشام سے قطعی
نفرت تھی وہ نہ خلافت کے خواہشمند تھے نہ اختیارات کے ہمیشہ اسوقت
صاف کہہ دیا کہ مجھ کو نہ اس مسند کی ضرورت ہے نہ اس طمطراق کی حاجت
خود ہی مرید ہوں دوسروں کو کیا مرید کروں گا ایک گوشہ میں بیٹھ کر
اللہ اللہ کرنا ہے دو گز زمین دیدو یہی رہنے کو کافی اور مردہ کو بہت
ہوگی مگر جو جلال شاہ کے ہمعصر مولانا کے شاگرد ان رشید اس پر رضامند
نہ ہوئے کہ جلال شاہ کی موجودگی میں پیر کی تسبیح اپنے گلے میں ڈال لیں

اس اصرار نے جلال شاہ کو مجبور کر دیا اور خانقاہ حسین آباد سے جلال شاہ کے فیض کا اسا دریا بہا کہ مسلمان ہی نہیں دنیا سیراب ہو گئی۔

مریدوں کی تعداد تیس چالیس ہزار سے زیادہ ہو گی اور معمولی نہیں بڑے بڑے عالم راہد امیر رئیس مگر سب کو یہ ہی ارمان رہا کہ کبھی کسی خدمت کا حکم ہو اور تعمیل کریں شاہ صاحب مجرد رہے گھر بھا یوی نہیں بچے تھے بیٹیاں تھیں بہوں نہیں دنیا کی ضرورتیں جیسی انسانی زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں انکی بھی تھیں مگر دو موروثی کھیتوں کی پیداوار انکی آمدنی کا ذریعہ اور زندگی کی کل کائنات تھی سکڑوں ہزاروں روپیہ کی سوغاتیں مرید لاتے اور گھر میں پہنچاتے مگر انکو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی وہی ایک وقت جو کی روٹی اور دو مرچ کی چٹنی انکی غذا گاڑھے کا ایک کرتہ اور میلا تہمد ان کا لباس ایک مدہنی ایک مسواک ایک بوریا انکی جائداد تھی صبح کی نماز سے فرصت پا کر حجرہ میں چلے جاتے اور ایک اوراد و وظائف میں مصروف رہتے ظہر کے واسطے فقرائی مریدوں کا مجمع رقت کا منتظر رہتا نماز کے بعد ان سے بات چیت کرتے اور عصر کے بعد کلام اللہ سے بیٹھتے مغرب سے فرصت ہوئی تو گھر میں گئے عشا تک ٹہلتے پھر باہر آئے عشا پڑھی اور جنگل میں نکل گئے اس وقت خاص خاص مرید ساتھ ہوتے اور فیض صحبت سے مستفیض ہوتے عام طور پر

لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ تھی گنتی کے دو چار گنے چنے آدمی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنکی ایک نظر انسان کو پارس بنا دے۔

اسوۂ حسنہ جس کا حکم مسلمانوں کو کلام اللہ نے دیا اور جس کا اسلام مسلمانوں سے متوقع ہے شاہ صاحب کے ہر فعل سے ہر قول سے زندگی کے ہر شائبہ سے رفتار کی ہر جھلک سے گفتار کی ہر ادا سے ٹپک رہا تھا وہ بظاہر زندہ تھے چلتے تھے پھرتے تھے کھاتے تھے پیتے تھے اور دنیا کے تمام کام انجام دیتے تھے مگر فنا فی الرسول تھے سوتے میں اُٹھنے میں بیٹھنے میں لیٹنے میں کھانے میں پینے میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ انکی زبان اس ذکر سے خالی رہتی ہو بعض دنیا دار علمائے جنکی دکانیں اچھی طرح نہ چلتی تھیں انکو مدعی کا لقب مشرک کا خطاب کافر کا اعزاز عطا فرما دیا تھا اور ہادی البشر میں ان بیچاروں کے یہ عذرات کچھ بیجا بھی نہ تھے دنیا بھر کے جتن کر ڈالے کتابیں لکھیں رسالے لکھے وعظ کہے تلقین کی انجمنیں تیار کیں مسجد مدرسے کونسل حلقہ ہیں سب ہی چیزوں کے بنوانے کا اعلان کیا حج کی تیاری کی تم جانو کی ساڈالی مگر وہ بات نصیب نہ ہوئی جب تک ایک موقوف بھی دنیا میں موجود ہے عقلمند بھوکا نہیں مر سکتا کامیاب سرور ہوئے اور بہت سے بندگان خدا ان کے

ڈھنگ پر آگئے لیکن جو بات شاہ صاحب کے ہاں تھی وہ نہ میسر ہوئی
نہ ہو سکتی تھی باوجود اس کیینہ و کاوش بغض و عداوت کے کہ مولوی آپکے
برخلاف ہمیشہ رہرا اگلتے رہے انہوں نے کبھی ان میں سے کسی کے
برخلاف ایک لفظ تک نہ کہا اور ان کے حق میں دعا خیر کی۔
مرید انکے عاشق زار تھے اور وہ دوسری دھن میں مست تھے علائق
دنیوی اگر سنت رسول نہ ہوتے تو انکو بال بچوں کی بھی زیادہ پروا نہ تھی اور
گو انکی طبیعت اس طرف کچھ زیادہ لگاؤ نہ رکھتی تھی مگر محسوس کا فعل تھا
اور مطلوب کا ارشاد اس کو بھی سر آنکھوں پر رکھا۔ دس برس کی عمر سے
پینسٹھ برس کی عمر تک تقریباً پچاس سال شاہ صاحب کی زندگی خلق اللہ
کے واسطے اسلام کا ایک قابل تقلید نمونہ رہی اور اس عرصہ میں انہوں
نے دکھا دیا کہ مسلمانوں کو کس طرح زندہ رہنا چاہئے اور خدا کی رضامندی
کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔
آخر عمر رو بہ انحطاط ہوئی اور گو قوی ہیکل آدمی تھے اعضا میں کسی قسم کا
فتور یا طاقت جسمانی میں کوئی نقص نہ تھا مگر ٹرہا ما شروع ہوتے ہی
ضیق النفس کا مرض بری طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ابتدائی حالت میں
تکلیف کو زیادہ محسوس نہ کیا اشتعال میں فرق آنے نہ دیا مرض کی طرف توجہ
ہوئی نہیں یہ لاپروائی شاہ صاحب کے واسطے اچھی نہ ہوئی اور اندر ہی اندر

بیماری ترقی کرتی گئی جب یہاں تک پہنچی کہ ایک نوالہ بھی حلق سے
اترجاتا تو سانس کا لینا دوبر ہو جاتا لاکھ کھانے کی طرف رغبت ہمیشہ
کم رہی اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف آدھ سیر جو کا آٹا معمول
رہا مگر پھر بھی بھوک اضطراری تھی اور حیات انسانی کا لوازمہ عصر کو نہیں
عشا کو رات کو نہیں صبح کو لگتی اور مجبور دو چار نوالے جس طرح بھی ہوتا
کھاتے لیکن روٹی تیر کی طرح لگتی اور پانی چھریوں کی طرح گھستا سانس لینا
مصیبت ہو جاتا اور سینہ کی یہ کیفیت ہو جاتی گویا کوئی تیر جگر تو سے
کھرچ رہا ہے - یہ حالت سنا ہے تین مہینہ تک رہی اور اب شاہ صاحب
کو اپنی زندگی سے قطعی مایوسی ہو گئی وہ مرنے کے واسطے ہر وقت تیار
رہتے موت کو یقینی سمجھتے تھے اور مانتے تھے کہ اسکا کوئی وقت مقرر نہیں
یہ علم انسان کو نہیں دیا گیا مگر اب اس حالت نے اچھی طرح یقین دلا دیا
کہ اور چند روز کی ہوا کھالوں وہ وقت قریب آگیا ہے کہ دنیا سے
رخصت ہو کر خدا کے حضور میں حاضر ہوں -

شاہ صاحب کی خبر علالت اور مرض الموت ایسی چیز نہ تھی کہ چھپی رہتی
اور ظاہر ہو جاتی تو معمولی بات ہو کر ختم ہو جاتی مریدوں کی تعداد اتنی
معقول شہرت اس قدر عام ہر دلعزیزی ایسی زیادہ حلق اسا ٹرہا ہوا انکسار
یہ کچھ مرید کیا اور غیر مرید کیا ہر شخص شاہ صاحب کا عاشق تھا جس لوگوں نے

ایسی نفسانیت اور دنیا داری کی وجہ سے ہمیشہ عداوت رکھی وہ بھی ظاہر
نہیں بلکہ دل میں انکی عظمت کے معترف اور خلوص کے مداح تھے۔
اب شاہ صاحب کو اٹھنا بیٹھنا اجیرن ہوگیا اور سفر دور میں یہاں تک
نوبت پہنچی کہ رفع ضروریات کے واسطے بھی خود نہ جا سکتے تھے اس حالت
میں مریدوں کا مجمع ہر لمحہ انکی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور اس آخری دنوں میں
شاہ صاحب انکو بہت طبیعت ٹھیک ہونے کی نصیحت فرماتے رہتے ایک روز
آدھی رات کے وقت طالب کو زیادہ کرنے والے مرید بھی موجود تھے
کہ شاہ صاحب نے اپنے موت کے متعلق اس طرح گفتگو کی۔
مذہباً موت کی تمنا جائز نہیں اس لیے میں ہرگز موت کا متمنی نہیں مگر موت سے
غافل ہونا مسلمان کی شان نہیں اس لئے میں نے اپنے کو موت کے لئے
وقت اسکے لئے تیار رکھا ہے تاکہ وہ سواری جسے دنیا اور دنیا کے فانی تعلق
میری نگاہ میں ہیچ کر دیئے اور میرا مقصد کسی طرح منزل مقصود تک پہنچ جائے
پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا۔ دنیا کا قیام قریب قریب ختم ہوگیا
اور اب دوسرا سفر شروع ہوتا ہے یہ ہے وہ سفر جسکی ہر منزل کٹھن اور ہر قدم خوفناک
لوگ سمجھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کو ختم کر گئی مگر نہیں بات یہ نہیں ہے
موت کہتے ہیں انتقال کو یعنی تبدیل ہو جانا روح کا ایک جگہ سے تبدیل ہو کر
دوسری جگہ چلی گئی درحقیقت اسلام نے روح کا مسئلہ اسی طرح حل نہیں کیا

اور یہ ایک زبردست مصلحت تھی اور صرف حکم رب بتا دیا مگر جہاں تک
اسلام سے ہماری سمجھ کے لائق اسکی تصریح کی وہ یہ ہی ہے کہ روح ایک
جسم کو چھوڑ کر دوسری ہیئت اختیار کر لیتی ہی اس کے معنی یہ نہیں ہیں
کہ زندگی ختم ہو گئی اگر ایسا ہو تو موت سے بہتر اور اچھی نو کوئی چیز ہو ہی
نہیں سکتی کہ سب عذابوں سے چھٹوا دے۔ موت ہادم اللذات ہی اور
ان تعلقات کا خاتمہ کر دیتی ہی جو یہاں ہمنے اپنی ذات کے ساتھ پیدا
کر لئے اور جو درحقیقت مستقل نہیں بلکہ ہماری زندگی تک یا اپنے وجود
تک کے تھے یہ تبدیلی یا انتقال موت سے ظہور پذیر ہوتا ہی۔ پونہچاتا ہی
ہمکو اس مقام پر جہاں اس زندگی کے اعمال و افعال کی جوابدہی اور بازپرس
ہے اور اسوقت تک صرف دو باتیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں حقوق اللہ
اور حقوق العباد مگر سمجھنے کی بات یہ ہی کہ حقوق اللہ کے احکام صرف
حقوق العباد کی ادائگی کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں جبتک کسی حاکم کا
ڈر نہ ہو رعیت باہمی سلوک اور اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر سکتی
مگر قانون کا منشا صرف یہی ہے کہ مظلوم ظالم کے ظلم سے کمزور طاقتوروں
کی طاقت سے محفوظ رہیں دنیوی قانون تمکو چوری و غارتگری فریب سے
روکتا ہے اور قدرت کا قانون ہمسے کچھ اور توقع رکھتا ہی تم ہی جیسے
ہزارہا بندگان خدا جنکے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک تمسے بھی بہتر ہیں مدبریں

زندگی بسر کر رہے ہیں اور تمہاری ہمدردی کے محتاج ہیں۔ راٹڈیں جو پردہ
کی بیٹھے والیاں ہیں معصوم بچوں کو کلیجہ سے لگا کر سلسان وقت میں
بھوکی پیاسی خاموش پڑ رہتی ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہی جب تم ایسا
اور ایسے بچوں کا پیٹ بھر کر اچھی طرح خود کھا کر انکو کھلا پلا کر ایسے ہنستے
بولتے ہو کھیلتے کودتے ہو اور ایک لمحہ کو بھی اس بدنصیب کا خیال نہیں
کرتے جسکا یتیم بچہ وہ وقت کے ہاتھ سے ماں کی گود میں تڑا مڑا مٹ رہا اس کا
منھ تک رہا ہی اسکے سر پر وارث نہیں ہی جو اسکو کما کر کھلائے ہاں قدرت
نے اسکے حقوق اسوقت جب موت نے اسکو بیکس کر دیا تم پر مقرر کئے
اور یہ ہی بہت بڑا حقوق العباد ہی۔ ایا ہیچ بیکس حاجتمند جبکا دینے والا
سوا خدا کی پاک ذات کے کوئی نہیں کہاں سے ایسی ضرورتیں پوری
کریں خدا انکو خود آکر دینے سے رہا تمکو جو کچھ دیا ہی اس میں انکا حصہ
بھی شامل ہی نہیں دیتے خود کھاتے ہو غصب کرتے ہو ظلم کرتے ہو اور حقوق العباد
میں مبتلا ہوتے ہو۔ یہ ہیں وہ جرم جنکی بازپرس ہوتی ہی اور جنکی وجہ سے
میرا تمام اعمالنامہ سیاہ ہی میں کہنے کو کہہ رہا ہوں کہ موت کے واسطے
تیار تھا مگر غلط کہہ رہا ہوں ایک کام بھی ایسا نہ کیا جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتا
امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے موت سے کچھ پہلے فرمایا تھا کہ ستر برس
زندہ رہا اگر دن رات میں ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو کتنے ہزار گناہ لیکر

حاضر ہونگا اس خیال کے آتے ہی ایک چیخ ماری اور گر پڑے موت
اب ان گناہوں کا پردہ کھولے گی اور بتا دیگی کہ نہ وہ لذتیں رہنے
والی تھیں نہ وہ وقت ہاں انکی یادگار ان کا ثمرہ اب خدا کے حضور
میں حاضر ہو کر بھگتنا ہے تم لوگ میری عقیدت کا یقین کر رہے ہو اور
سمجھتے ہو کہ میں بہت نیک آدمی تھا مگر میں ہی جانتا ہوں کہ گناہوں کی
کیسی بھاری گٹھری میرے سر پر ہے وہ دربار بڑا ہے اور وہ شہنشاہ
زبردست اور باوجود رحیم و کریم ہونیکے علی مرتضیٰ کے الفاظ یہ تھے۔
جاتا ہے واں جو صاحب عرش عظیم ہے شاید وہ بخشدے کہ غفور الرحیم ہے
بتاؤ اب میں کس گنتی میں ہوں۔

بچوں والی بیوہ کی موت

سلطان دلہن جسکا اصلی نام سعید مالو تھا ان بیویوں میں سے بیوی بیٹیوں
میں سے بیٹی بہوؤں میں سے بہو تھی جسکی نظیر اب تو کیا اسوقت بھی مشکل سے
ملتی تھی نسوانی حیا و مسلمانوں کا ایمان اور عورت کا زیور ہے قدرت نے
انمیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی سسر گو کی اطاعت ساس سسروں کا
ادب بھوٹوں کا لحاظ کمروں سے ہمدردی زبانی ڈھکوسلا اور اخباری
شوشہ ہی نہیں عملی طور پر ظاہر تھی شوہر برابر کا شریک نہیں سر کا سرتاج

اور ساس سدیں ماؤ کی جوتی نہیں سر کا سر پوش تھیں یہ وہ جوہر تھے
جو ماں کے دودھ کے ساتھ گھٹی میں پڑے اور سعید بالو جہز میں میکے سے
لیکر آئی گورمانہ کی ہوا کے ساتھ چلنے والی دو چار لقمدرماں بیاں بھی
موجود تھیں مگر پکا رنگ انکی صحبت سے چھوٹنے والا نہ تھا سعید مالو
عورت کہ دیا ادھر کی اُدھر ہو جائے اور اسکی نار قصاہ ہو ٹھیک
مغرب کے وقت ماہ موسم سدا کیا جانے بتر دوع سروع میں سلطان مرزا
کا بھی سیاستوق اور گھونگٹ کی ئی دبن طلبعہ سر در دل سر کھی کچھ
مگر اچھیں ہوا عاموش رہا مات کم کی مگر حیالات جو پیر ورستی
یاتے پانے راسخ ہو چکے تھے اب کہاں مٹتے اس سے شوہر کی فرماں برداری
ایسی کی کہ چھدہی روز میں سلطاں اسکے مارے دھر دھر کرنے لگا۔
سعید مالو گرے پڑے ماں کی بیٹی تھی دادا صدر الصدور ارڈ پڑھ
کا سر تتہ وار پہلوٹھی کی بچی اور اکلوتی اللہ آمین سے ملی ماؤں میں بڑی
مگر الفت و محبت مامتا اور جوش کسی چیز سے اسکو مستقل سے سیوش نہ کیا
سوہر کی اطاعت ساس سدو کی حد سے ساری سسرال گرویدہ
ہو گئی سلطاں کی ترقی تحصیلداری پر ہوئی تو نہ جامہ سے باہر ہوئی نہ خالی
میں فرق آیا منکسر ہمیشہ کی تھی اب بھی رہی اور ہمدردی جو شیوہ تھا
ہی اسوقت بھی اسکے ہاتھ سے نہ گئی۔

کہے کو تو اولاد مفلس کے ہاں مصیبت اور مالدار کے ہاں نعمت ہو مگر
سب کہنے ہی کی باتیں ہیں غریب کی ماسا امیر سے کم نہیں ہوتی ہاں
امیر کے ہاں چاؤ چونچلے ارماں پورے ہوتے ہیں غریب دل مسوس کر
رہ جاتا ہی بانو اس نعمت سے کیوں محروم رہتی خدا اس سے راضی خلق خدا
اس سے خوش دس سال کے اندر تا بڑ لوڑ جیہہ سے ہوئے۔ اوپر تلے
کے بہن بھائی برابر کے لڑکے برابر کی لڑکیاں دن بھر وہ غل مچتا کہ
کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی اب اسکو چاہے ماں کی سرست سمجھو یا باپ کا
خوف کہ اسکے سامنے تو ذرا امس ہو جاتا مگر اسے باہر قدم رکھا اور پھر
وہی کھیریاں بکی شروع ہوئیں بہا ہوا رمانہ تحصیلداری کا گھر خیالات
کی اچھی دل کی فراخ مسوں ترکاری اور سیروں مٹھائی پڑوسنوں تک کو
بانٹ دیتی کپڑا اللہ کہنا یا تا مرتے فروش حیرت اول تو بالو ہی کا خاصہ
معقول تھا اور پھر سلطان کا شوق تو اس درجہ بڑھا ہوا کہ جب بازار گیا
کبھی خالی ہاتھ آیا ہی نہیں سو پچاس کا سامان لے ہی کر گھر میں گھستا میں قیمت
انگوٹھیاں اعلی درجہ کے ریشمیں کپڑے ایرانی قالین انواع واقسام کی
میز کرسیاں غرض جتنا ساماں ایک اکیلی بانو کے پاس موجود تھا شاید
دوسرا اچھے اچھے رئیسوں کے ہاں ملا کر بھی اتنا نہ نکلے گا۔

اس الر کلنگ نہیں کرنگ ہی تو یہ کہنا یقیناً صحیح ہوگا کہ مالو بنگیاہ تھی

اور ظالم دنیا کا بے وجہ سنگار ہوئی اور اگر نیک سدے آرمائے جانے
ہیں تو قدرت کے کاموں میں ہم رائے دینے والے کون سلطان دورہ
پر تھا جاڑوں کے دن تھے علی الصباح پرتال کو نکلا گھوڑی تیز بھی بندھی
ہوئی عرصہ کی ٹھنڈی ہوا لگتے ہی سرپٹ ہوگئی روکنا چاہا نہ رکی آسن
اکھڑ گئے سوار اچھا تھا مگر وقت کی مات اور موت اٹل گرا پاؤں رکاب
میں، رہ گیا ظالم گھوڑی اب بھی نہ تھمی سر چکنا چور ہوگیا اور اسی حالت
میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

الو کہنے کو تو نہایت صابط اور مستقل مزاج عورت تھی اور کہنے کو کیا
تھی بھی بات کی موت پر حالانکہ اسکی عاشق تھی نہایت صبر سے کام لیا۔
ما اور مالو حلسی بیٹی کی ماجسکی محبت کنبہ بھر میں مشہور تھی دونوں میں چپٹ
پٹ ہوگئی مگر مالو کی آنکھ سے آنسو نہ نکلا حقیقی بھائی جوان شیر اور ایک
چھوڑ دو دو بہنیں آنکھ کے سامنے سے اٹھ گئیں مگر استقلال میں فرق
نہ آیا لیکن سلطان کی موت سے چپکے چھڑوا دئے روئی نہیں بیٹی نہیں
چیخی نہیں چلائی نہیں ہاں خاموش تھی گم سم ہر وقت کسی خیال میں مستغرق
اور ہر لمحہ کسی فکر میں سر سار تڑی حرامی یہ آکر بڑی کہ دیور نگلی گھونسا جسے
ہمیشہ کھایا اور نگلا بھائی کے مرتے ہی دیدے بدل گیا اور ساری جائداد
دبا بیٹھا بالو یر دہ نشین بیچے معصوم لڑنا تو درکنار کوئی بولنے کے قابل

بھی نہ تھا رتی رتی سارا مال قبضہ میں کر لیا اور سوا تھوڑے سے زیور اور گھر کی معمولی چیزوں کے مالو اور اسکے بچوں کے پاس کچھ نہ رہا کچا ساتھ خالی ہاتھ جیسے آئے اور سب ماداں بڑا مکان چھوڑتیں روپیہ ماہوار کے مکان میں چلی آئی زیور اور انا سب کب تک چلتا ایک سال ہی بھر میں خالصے لگ گیا اور بہت فاقوں تک پہنچ گئی۔

اب البتہ بالو کے ہوش حواس بگڑ گئے آمدنی کوڑی کی نہیں آٹا جائے دونو وقت میں پاسیر لوٹہ اور کٹورہ دو بٹے اور فالس سب بک گئے مگر پیٹ کی آگ کسی طرح نہ بجھی جب گھر کا صفایا ہو گیا اور رات کر بدلے کو تنکا تک نہ رہا تو سوچا مزدوری کروں سوائی سیئوں ٹوکری ڈھوؤں یا مانگیری کروں لیکن کسی طرح ان مصیبتوں کے حلق میں ٹکڑا ڈالدوں۔ راتیں اس طرح بیتیں کہ برسات کی اندھیری گھپ رات تو بس مٹی کا دیا تک اعیشت ہوا دن اس طرح بسر ہوئے کہ صبح سے شام تک بالو اور اسکے کلیجے کے ٹکڑے لق لق کرتے موسے پڑ رہے اور قدرت کے زبردست انتظام نیند کے فعل کو پورا کر دیا ایک دن پوری رات اور سارا دن سات دن فاقے سے بسر ہو گیا شام کے وقت ایک دو بہیں اکٹھے چار لال ایک ایک دانہ کو ترسے اور ٹھٹھرتے ماں کے پہلو میں بیٹھے فاقہ زدہ بچے اور بھوکے معصوموں کی صورت دیکھ کر کلیجہ کٹ گیا نہ پہلا دن اور سایہ پہلا

موقعہ ہوگا کہ بالو کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے بڑا بچہ جو شکل سے
سات برس کا ہوگا ماں کے قریب آیا اور کہا اماں جان روتی کیوں ہو
بچہ کے اتنا کہنے سے دل بھر آیا مگر بچہ یہ کہتے ہی کلیجہ سے لپٹ گیا
ماں کے آنسو پونچھ کر خود بھی رونے لگا بھیج کر پیار کیا اور کہنے لگی میاں
روہیں رہی اللہ تمہاری عمر دراز کرے رونے کیوں لگی۔

(بچہ) اماں جان بھوک تو زور کی لگ رہی ہے دیکھئے کل شام کی بیسی
روٹی کھائے ہوئے ہیں۔

(ما) میاں صبر کرو دیکھو اللہ بھیجے گا سیکے سو جاؤ میں تم سب کو جگا کر
کھلا دوں گی۔

بالو نے کہنے کو یہ بات بچہ سے کہہ دی مگر طبیعت بھری آرہی تھی
کہ کیا سے کیا ہو گیا جس گھر میں دو دو بیٹے تین نوکر اور اماں موجود
تھیں آج وہ مٹھی بھر بیسوں کو ترس رہے ہیں منہ پھیر کر رو رہی تھی اور
آنسو پونچھ کر چمکارتی تھی مانو ادھر محو تھی دروازہ پر لولا دال موٹ والا
اور چھوٹا بچہ بیسیہ کے مرمرے اور پیسہ کی دال موٹ لے آیا تین سر کی
جان ساط کیا تھی بھولی ٹھہری ہوئی ساری دال اور مرمرے موری میں
گر پڑے دو دانے باقی رہ گئے ابھی ماں کے پاس پہنچا بھی نہ تھا کہ جینے
والے بے بیسوں کا تقاضہ کیا مانو کو اسوقت دو بیسے دو استدعیوں سے

زیادہ تھے کچھ دیر خاموش رہی مگر جب اسنے زیادہ بگڑا اور چلانا شروع کیا تو دروازہ پر آئی اور کہا۔

بھائی! تمسے سودا کیوں دیدیا یہ ہے سب پھینکدیا اسوقت پیسے نہیں ہیں پھر لے جانا۔

جیسے والا۔ پھر لیجانا، دو پیسہ کے لئے تو ضرور آؤنگا۔ میں نہیں جانتا پیسے دو میرے لاؤ لاؤ جلدی کرو دیر ہوتی ہے۔

بانو۔ بھائی میں سچ کہتی ہوں پیسے موجود نہیں ہیں پھر لیجانا۔

جیسے والا۔ کیسی پھر عقل جاتی رہی ہے پھر لیجانا پھر لیجانا کیا مفت کا مال تھا یہ سے منگوا اور کھا لیا پیسے پھر لیجانا کوئی ٹٹس ہر کمر باندھی ہے۔

گھبرا گئی پریشان ہو کر گھر میں آئی پیسہ تو درکنار کوئی چیز بھی نہ تھی کہ دیکر پیچھا چھڑاتی جیسے والا زور شور سے چلا رہا تھا محلہ کے بچے جمع ہو گئے ایک نے اندر آکر کہا۔

ارے بی بی کیوں نہیں دیتیں اس بیچارے کو دیر ہو رہی ہے۔

بانو۔ اچھا میاں۔

دوسرا لڑکا۔ لاؤ تو لاؤ۔

بانو۔ اس سے کہدو پھر لیجائیو۔

لڑکا۔ وہ تو اب لیکر جائیگا پھر ورنہ نہیں جاتا اور نہیں تو لڑکے کو ماہیچہ دو

وہ اس سے لے لیگا۔

اتفاق کی بات تھی کہ اسوقت چمپا یرانی سائیسی مدتوں کے بعد نکل آئی بچے اسکو دیکھ کر اُچھلنے لگے سلام کرکے بیٹھ گئی مانو کا رنگ دیکھکر دنگ رہ گئی اور چمپا سے بولی۔ بیٹی کر کہا کہ۔

ارے بی بیسے دیہی ہو یا ڈاکہ ہی پر اُتر آئیں،،

مانو دہل گئی اور چمپا سے کہا بوا میرے پاس دو پیسے ہیں،

چمپا نے کچھ سوچا اور پھر کہا آٹے کے رکھے ہیں لو لیلو۔

دو پیسوں کے واسطے مانو نے چمپا کے آگے ہاتھ پھیلایا اور پیسے چمپا کو پھیر دیئے۔ بات معمولی تھی گئی گذری ہوئی مگر آج کا چرکا ایسا اسکے دل پر بیٹھا کہ ساری رات روتی رہی سوچتی تھی کہ وارث سر پر رہا نہیں میں ایک عورت ذات اور ان بچوں کا ساتھ کیونکر پالونگی کیا کرونگی یہاں تک نوبت پہنچ گئی اب رہ رہ کر مدتری ہی کیا ہوگا یہ دہاکا ایسا بیٹھا کہ آخر رات کو جب تارے کھلے ہوئے تھے اور مانو خدا کی قدرت میں محو ایسے مستقل پر غور کر رہی تھی بخار چڑھا گلابی جاڑے تھے کیڑا مدن پر تھا نہیں سینہ میں درد شروع ہوا اندر آکر لیٹ گئی سمجھی کہ اب چلنے کا وقت ہی یہ خیال آتے ہی کلیجہ امنڈنے لگا بچوں کو ملا کر گلے سے لگایا ایک ایک سے چمٹی اور کہا کلیجہ کے ٹکڑو ماں کی حالت حرام ہے

باپ کا سایہ تمہارے سروں سے اُٹھ گیا ماں اس قابل بھی نہ نکلی کہ تم
معصوموں کے پیٹ بھی بھر دیتی بیاروں دکھ رہی ہوں کہ برسوں سے
بھوکے ہو مگر کیا کروں کوئی جگہہ نہیں کہ ہر جاؤں کس سے مانگوں
رہدہ رہی تو کسی کے ہاں نوکری کرونگی اور تمہارا پیٹ بھرونگی دعا کرو
کہ اچھی ہو جاؤں یوں بیٹھو میرے پاس بیٹھو یہاں سے نہ سرکو میری آنکھیں
تم کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی ہو رہی ہیں او گودڑ کی سندر بچارکی تیری حد سے
زیادہ ہے مگر دل تمہاری صورتوں سے تسکین پا رہا ہے۔ فردوس دیکھ چھوٹا
رو رہا ہے اسکو گود میں لے لا میرے سینہ پر ڈالدے آ میرے چاند
میں قربان گئی اے اللہ شکر ہے ایک پیسہ نہیں کہ اسکو دودھ منگوا دیتی
تین دن کا بھوکا پیاسا سا تکر ہے سکر۔

سحار تیز ہو رہا تھا بچے چاروں طرف بیٹھے رو رہے تھے کسی کے سر پر ہاتھ
پھیرتی تھی کسی کو کلیجہ سے لگاتی تھی روتی تھی ملکی تھی لپٹتی تھی اور چمٹتی تھی

روؤ مت کلیجہ کے ٹکڑو روؤ مت دعا کرو کہ اچھی ہو جاؤں ہر دم سر پر
لوگی باہر نکلو گی ٹہل کرو گی مدہیا گری کرو گی مگر اپنے بچونکو بھوکا نہ رکھونگی
مگر ہائے مر جاؤنگی تو کیا کروگے کسی کی غلامی کسی کی نوکری اے اللہ
رحم کر اسوقت تک رہدہ رہوں جبتک نہ کمانے کے قابل ہو جائیں
فردوس حلق میں کانٹے پڑ گئے زبان سوکھ گئی کہاں جیکی میٹھی ہے

اری دیوانی نہ رولا ذرا سا پانی پلا میں اچھی ہو جاؤنگی۔
فردوس بڑی بچی تھی سمجھتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے ہچکی بندھ گئی دوڑ کر ماں کے
کلیجہ سے چمٹی دونوں ہاتھ اسکی گردن میں ڈالدئے اور کہنے لگی بیٹی ہر ساں
نہ ہو اللہ رحم کریگا اری میرا بیڑا بھلس رہا ہے تجھکو سہارا ہو جائے چمٹ
مت ہٹ جا۔

بڑا لڑکا خاموش بیٹھا حسرت سے ماں کے چہرہ کو تک رہا تھا گاہ اس پر
لو بھی کہنے لگی کیوں مرے لال چیخا کیوں ہے اٹھتی ہوں بھیک مانگونگی
اور لاؤنگی آ آ میرے پاس آ میرے چاند آ لپٹ جا۔
بچہ کا دل پہلے ہی سے بھر رہا تھا ماں کے اتنا کہتے ہی بیتاب ہو گیا اور
چیخ مار کر گلے سے لگ گیا ماں کا ہاتھ بڑے بچے کی کمر پر تھا کہ ہچکی آئی
اور فاطمہ روہ یہ کہکر ہو کا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

۸۶ بادشاہوں کی موت

اب تک میں نے اور مولانا راسد الخیری نے جسقدر مضامین موت کی نسبت
اس کتاب میں لکھے وہ خیالی تھے یا واقعات کو خیالی پیرایہ میں دکھایا گیا
تھا نہ مضمون خالص تاریخی ہے جسکو رسالہ کم ٹو موت کے لئے جناب مولانا
عارف حسن صاحب عارف ہسوی نے تحریر فرمایا ہے مولانا عارف مشہور

اہل قلم ہیں جنکے رشحات علمی سے اکثر بڑے بڑے اخبارات فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔

حسن نظامی

موت کا فلسفہ بیان کرنا فضول سی بات۔ ہر عالم و جاہل اور ہر فلسفی و عاقل بغیر فلسفہ کے اسکی کیفیت سے واقف و آگاہ ہے۔ دنیا کی ایک چیز بھی ایسی نہیں بلکہ معلومات انسانی میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو ستم دیفیس کے مسائل سے نہ گذرا ہو یہاں تک کہ وجود باری بھی شک اور یقین کی کشمکش میں پڑ گیا۔ لیکن دنیا خواہ ہر چیز کو حتی کہ اپنے نفس وجود کو بھی شک و شبہ سے دیکھے لیکن موت کی نسبت جرات نہیں کر سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ موت ہادم اللذات ہے اسکا آنا برحق اور اسکے نتائج مضرہ کا مرتب ہونا یقینی ہے نہ عجز و مسکینی اس کو روک سکتی ہے نہ سلطنت کا جاہ و جلال اسکو منع کر سکتا ہے نہ تقوی و طہارت اسکو مار رکھ سکتا ہے۔ فقیر کا ٹوٹا ہوا جھونپڑا اور بادشاہ کا عالی شان قصر حکومت اسکے نزدیک دونوں یکساں ہیں جس طرح وہ کھلے ہوئے میدان میں آسانی گذر کر سکتی ہے بالکل اسی طرح تہہ خانوں کے بروج مشیدہ میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اسے بوڑھے باپ کی بیکسی اور کھیاری ماں کی بیکلی پر کبھی رحم نہیں کیا وہ آرزوؤں کے ہجوم اور تمناؤں کے

ازدہام کی مایوسانہ حالت اسے کبھی مرعوب نہیں ہوئی۔ اس کا وجود
رنج و مصیبت سے ناآشنا اور اسکی ہستی راحت و مسرت کے احساس سے
بیگانہ ہے وہ جس طرح عجب و غرور تمرد و سرکشی اور ظلم و سفاکی کو برباد
کر دیتی ہے اسی طرح عفو و رافت تقوی طہارت اور انسانی رحم دلی و
ہمدردی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے۔ اسکے نزدیک اضطراب و بیقراری
بیچینی و بیتابی مہمل الفاظ ہیں اور آہ و زاری فغاں سنجی و ماتم گساری
کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اسکی مادہ سی رحم سے بے نیاز اور اسکی مہمان
پسندی لطف و کرم سے مستغنی ہے۔

لیکن بااین ہمہ میں کہتا ہوں کہ انسان کا بہترین دوست موت ہے
اسکی دشمنی سراپا اکرام اور اسکی عداوت یکسر رافت و انعام ہے اگرچہ
وہ عافیت کی دشمن ہے مگر عاقبت کی رہبر اور آخرت کی رہنما ہے اس کا
ورود داب قدوس کی معرفت کا زینہ اور اس کا وجود بصائر و عبر کا گنجینہ ہے
اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے تو موت ہدایت اخروی کا سب سے
زیادہ موثر وعظ ہے وہ اپنے آثار حزن و ملال کے اندر انسانی عبرات کے
لئے عبرت اندوزی و سبق آموزی کی لاتعد و لاتحصی کتابیں مخفی رکھتا ہے
خوش بیان واعظوں کی سحر کلامیاں پند و نصیحت کے بیدار کن اور اختتام
شریعت کے لعنت تنبیہ و سرزنش ایسی تاریخ عبرت اعلان نہیں ہیں

کر سکتی جسقدر موت کے یہ ہلاکت و فنا کی صرف ایک گرد بہم پہنچا
دیتی ہے۔ حکومت کا گرز گراں اور اخلاق کا اثر اقتدار دفتر موعظت
انسانی غرور و عظمت کو اس قدر جلد شکست نہیں دے سکتا جس قدر
جلد موت کی بے رحمی کے آگے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔
غرضکہ موت جسکو تم ظالم و جفاکار سمجھتے اور اپنا بے رحم دشمن خیال کرتے
ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارا ناصح مشفق ہے۔ تمہارے کسب اعتبار کیلئے
پند و موعظت کے دفاتر کھول دیتی ہے تمکو گمراہیوں سے بچاتی اور
ضلالت سے روکتی ہے تم دنیا میں آکر اپنے خالق کو بھول جاتے ہو
وہ اسکی یاد دلاتی اور ہمیشہ یاد کرتی رہتی ہے۔

یوں تو ہر ذی حیات کی موت ایک مرتبہ عبرت ہے۔ ننھی سی
چیونٹی جسکو تم عقل و غرور کے پاؤں سے مسل ڈالتے اور ہلاک کر
ڈالتے ہو اسکی موت بھی عبرت سے خالی نہیں تمہاری طرح اس کا حقیر
جسم بھی درد و تکلیف کو محسوس کرتا ہے دکھ سے وہ بھی بھاگتی ہے اور زندہ
رہنے کی وہ بھی خواہش رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ تم ایک چیونٹی کی موت سے
متاثر نہیں ہوتے یہ تو اس حشر خیز کا موت بھی کچھ کم عبرت خیز نہیں
لیکن بادشاہوں کی [illegible] عبرت کی ایک مرتبہ ہے جو فانی
انسان کی [illegible] اس پر مسلط کر دی ہے

کیسے بڑے بڑے بادشاہ جنکے نام سے دنیا لرزاں تھی آج پیوند
خاک ہیں۔ بنی امیہ کے ظلم و سفاکی اور جبر و تعدی کے صرف افسانے
باقی ہیں مگر انکی رہبیت صرصر موت نے ہمیشہ کیلئے خاک و خون میں
ملا دیں۔ سو عباس کا جاہ و جلال کیا ہوا جنکے سطوت و جبروت سے
قیصر و کسریٰ کے بدن لرزہ براندام ہو جاتے تھے اور جو فرانس کے
شہنشاہ کو ملک الروم (رومی کیسے) کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔
جس کا آستاں جلال سرور و حکمت کا سجدہ گاہ تھا جنکے جسم و ابرو کے
اشارہ پر خون کے دریا بہہ جاتے تھے جنکا عطر و عصب شیروں کے
پینے پانی کر دیا تھا جنکا لطف و کرم گداگروں کو امیر الامرا اور جنکی بخشش
و انعاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیتا تھا۔ جو ایک بیوہ عورت کی
بے پناہ رسوخ تاجوں کے تخت حکومت کو الٹ دیتے تھے جو ایک
علمی مسئلہ کے حل اور ایک عمدہ شعر کے صلہ میں حکومت مصر کے خراج کو
بخش دیتے تھے۔ جنکے عالیشان قصر و جواہر اور اس واقعہ
کی ہمسری قصور ہست کے مشابہ اور جنکی بصرہ گاہیں اور دیگر
کے باغات گلزار ارم کے مماثل تھے آج وہ کیا ہیں۔ یہ اور ان کا ستر
کیا ہوا۔ تمکو معلوم ہے اور تم جانتے ہو کہ ان کو موت کے زبردست
ہاتھ نے سیر و خاک کر دیا انکی سطوت ان کا جلال حرف کتابوں میں

باقی ہی مگر وہ نہیں رہے اور نہ کبھی اس دنیا میں لوٹ کر آئینگے۔
سلجوقیوں کا نام و نشان نہ رہا خلجیوں کی دولت و اقبال برباد ہوگئی
غزنوی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تیموری خاندان کی تباہی و بربادی پر
اُنکے قائم کردہ آثار زبان خموشی سے نوحہ خوانی میں مصروف ہیں یہ
سب موت کے طلسم انقلاب کے نتائج ہیں۔

دہلی سے تھوڑی دور پر تغلق آباد یا فیروز آباد کے کھنڈروں کو
دیکھو معاً اسکے بانی کی تصویر سامنے آجاتی ہی جو ایک ہیبت ناک مقبرہ
کے اندر مصروف خواب ہی یہ مقبرہ فیروز شاہ تغلق کا ہی جسکی روحانی ہیبت
و جبروت آج بھی زائرین کے قلوب کو عظمت و وقار سے مرعوب کردیتی
ہے یہ نیک دل عالی حوصلہ کریم النفس اور دانشمند بادشاہ آج سے
پانسو برس پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا فیروز آباد
کا عظیم الشان شہر اسنے آباد کیا عالیشان عمارتیں بنوائیں دہلی کے قرب
و جوار میں بارہ سو باغات لگوائے تمدنی و اقتصادی ترقی میں نہایت
زیرکی و دانشمندی سے سرگرم رہا۔ مالیات کا نیا اور سہل العمل قانون
بنایا اور نافذ کیا رعایا کی فلاح و بہبود میں کبھی غفلت نہ برتی فیروز شاہ
کی نیک نیتی صرف اسی امر سے ظاہر ہوتی ہی کہ چالیس سال
کے عہد حکومت میں کبھی اسکی رعایا کو قحط سالی کے آلام و مصائب سے

سامانہیں کرنا پڑا اسکی فیاضی و دریا دلی نیز محلوں نواری و عیش
سروری کا اندازہ اس سے کرلو کہ جس وقت وہ تخت حکومت پر جلوہ
افروز ہوا جسقدر بقایا لگان اور تقاوی کا سرکاری روپیہ رعایا کے
ذمہ تھا سب معاف کردیا اور نہ صرف معاف کردیا بلکہ وہ تمام کاغذات
جنمیں یہ حساب و کتاب تھا جلوا دیا۔

وہ تمام عمر حوصلہ مند بادشاہوں کی طرح مہمات ملکی کے سر کرنے میں مشغول رہا
گجرات اور ٹھٹھہ کی مہموں کو اسنے فتحمندانہ خاتمہ تک پہنچایا سکندر خاں کو
شکست دی اور دوسرے باغیوں اور مفسدوں کا بھی قرار واقعی استیصال
کردیا لیکن باوجود جنگی مصروفیت کے ملک کے اندرونی انتظامات سے
کبھی غافل نہ ہوا۔ وابستگان دامن دولت کا اس قدر خیال ملحوظ
خاطر تھا کہ اسکے لئے یہ عام قاعدہ مقرر کردیا کہ جب کبھی کوئی ملازم سرکار
فوت ہو تو اسکی جگہ پر ہر حالت میں اسکا بیٹا مقرر کیا جائے بیٹا نہ ہو تو
اسکا داماد داماد نہ ہو تو غلام اور غلام بھی نہ ہو تو کوئی رشتہ دار اور اس کا
رشتہ دار بھی نہ ہو تو اسکی بیوی کا کوئی قریب یا بعید کا رشتہ دار اس
جگہ پر مقرر کیا جائے اس حکم سے متاثر ہو کر شیخ الاسلام شیخ بہاؤ الدین
زکریا ملتانی نے کہا ہے کہ آدمی کو مرنے کے دو طرح کے غم ہوتے ہیں ایک تو دن
کا سو اسکا حال کسیکو نہیں معلوم کہ کیا ہوگا دوسرے دنیا کا کہ میرے بعد

میری اولاد اور اعزا کیا کرینگے کیونکر زندگی بسر کرینگے مگر اس بادشاہ نیک نہاد نے دنیا کے غم کو دور کر دیا کیونکہ ہر شخص مرنیکے وقت مطمئن ہوتا ہے کہ میرے بعد میری اولاد میری جگہ پر مقرر کر دی جائے گی اور جس طرح میری گذر اوقات ہوتی تھی اسی طرح میری اولاد کی بھی ہوگی۔

فیروز شاہ بڑی شان و مرتبہ کا بادشاہ ہوا ہے وہ نہایت مستقل مزاج اولوالعزم صاحب اقبال اور جاہ جلال بھا فیروز آباد جیسے عظیم الشان تعمیر کی ہمیں اسکی حوصلہ بلندی کی دلیل ہے نوے برس کی عمر پائی اور چالیس برس تک بادشاہی آسان و سوکت کیساتھ ساطنت کی۔ آخر عمر میں جو آئیں کچھ تعطل موردار ہوا تو ایک بدباطن ورثے درعلاء سے اسے بیٹے کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا مگر وہ ایسے مکان میں مقفل ہو کر بیٹھ رہا اور موقع پاکر مسلح ایک ہزار اور بیٹھ کر شاہی زنان خانہ میں داخل ہو گیا اور وہاں سے بادشاہ کے حضور میں پہنچکر قدموں میں سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ اگر میرا ارادہ کچھ اور ہوتا تو اس وقت سے اچھا کوئی موقع نہ تھا یہ محض درگاہ کی شرارت ہے کہ حضور کو میری طرف سے مکدر کر دیا وہ چاہتا ہے کہ میری زندگی کا خاتمہ کر کے خود تخت حکومت پر بیٹھ جائے۔

فیروز شاہ نے اس کا سر اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور وزیر کے قتل کا حکم دیا

کر دیا۔ اسکے بعد خود فیروز شاہ تخت سے علیحدہ ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا اور بیٹے کو مہام سلطنت سپرد کر دیا تھوڑے دنوں زندہ رہا اسکے بعد ۳۔ رمضان ۷۹۰ھ کو وفات پائی۔ وفات فیروز مادۂ تاریخ ہے۔

وہ فیروز شاہ ہے جسکی عظمت اسکے بنا کردہ شہر کے کھنڈروں سے اب تک ٹپک رہی ہے لیکن اب اسکی اقبال مندی کا کوئی نام باقی نہیں رہا صرف چند ویراں و وحشت ناک کھنڈر ہیں جو اسکی تاریخ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ یہ کھنڈر عبرت کی تصویر اور تصیر سا کا مرقع ہیں جن مکانوں میں شمع کافوری جلتی تھی آج انہیں مٹی کا چراغ تک نہیں جلتا۔ کسی وقت یہی فیروز تمام بھاجیکے جلو میں لاکھوں سپاہی زرق برق رستا کر ہوتے اسکی حفاظت کرتے تھے مگر اجل نے وہ سارے سامان نکبت و تباہی کر دیئے۔ یہ ہمارے ہزاروں سال خاک کے نیچے دبا ہوا سو رہا ہے نہ کوئی محافظ ہے نہ دربان، نہ جمعیت ہے نہ خادم، نہ وہ سامان ہے نہ اسباب اس کا مسکن وحشی درندوں کا مسکن اور منحوس طائروں کا نشیمن ہے

چشم واکشا و حال شاہاں را نگر ماتیہ ماں از گرد ترک و گرد و اتش خزاں

بر وہ دای سبکہ بر قصر قصر عنکبوت بوم نوبت ہزار بر کنگرہ ایوان ایست

کی من علما ان ۔ ہی ۔ ہ یکہ ۔ ۔ اقبال و الاکرام
موت کا وقت آیا تو سارے ہی دولت رحکومت دھری رہ گئی سہ فوج و
سپاہ کام آئی نہ جاہ و جلال سب ہاتھ سے ملوت و ہر وسائل کی
پھر دیکھ کہ بادشاہ کی موت کس درجہ عبرت پذیر ہوتی ہے موت کی
تکلیف ترک تعلق کی وجہ ہوتی ہے جسکے تعلقات زیادہ وسیع ہوتے ہیں
اور جو جسقدر دنیا کی چیزوں میں وابستہ ہوتا ہے اسی قدر رنج و محن زیادہ
ہوتا ہے اگر آرزوئیں محدود اور تمنائیں محصور ہوں تو اسی نسبت سے
انکی جدائی کی تکلیف ہوتی ہے لیکن بادشاہوں کی وابستگی اور ان کے وسیع
تعلقات کا کیا ٹھکانا ہے

ایک گدا کی موت جو اس اہم نہیں اسلئے کہ وہ پہلے ہی کو دنیا ا ا
شاد و ہم و اجر سے جدا ہونا اسکے لئے اسقدر تکلیف ہو لیکن بادشاہ
جسکو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہیں چین و آرام اسکے در کے غلام اور راحت
سے رہتا اسکے گھر کی لونڈی ہے وہ گو ہر قسم کی چیزوں کی رکھتا ہے
اور ہر کی وسائل اور ہر کرتا ہے ۔ کھانے کے لئے بہترین غذائیں ہیں
کے لئے نفیس ترین کپڑے رہنے کیلئے عالیشان محل سر کیلئے بہت بہار
تفریح گاہیں خرچ کے لئے بیشمار دولت حکم پر چلنے کے لئے لاکھوں
آدمی ۔ آہ کیسا درد ناک اور الم انگیز وقت ہوتا ہوگا جبکہ ان سب سے جدا

ہوتے ہونگے ایک ایک چیز پر انکی نگاہ حسرت بار پڑتی ہوگی اور انتہائی مایوسی سے سانس دہ سب کو چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہونگے۔

اس سے زیادہ عبرت ناک شاہجہاں کی موت ہے جو تیموری خاندان کا چشم و چراغ تھا جسنے عرصہ تک باصد شان و شکوہ حکومت کی اتنی بڑی وسیع اقلیم ہند کا یکہ و تنہا فرماں روا بیشمار خزانے کا مالک لاکھوں آدمیوں کی فوج اسکی تابعدار اور اسکے حکم پر جان دینے کے لئے طیار۔ جسنے دلی جیسے عظیم الشان شہر کو آباد کیا تاج محل لال قلعہ موتی مسجد اور جامع مسجد دہلی جیسی عظیم الشان عمارتیں بنوائیں مگر مرا تو اس شان سے کہ نہ وہ تخت تھا نہ تاج نہ فوج تھی نہ سپاہ نہ حکم تھا نہ فرماں نہ وہ شان و شوکت تھی نہ وہ شاہانہ اقتدار سب سے بیدخل سب سے جدا قلعہ کے اندر قید کی بیکسی کے عالم ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

نادر شاہ جیسا جبار و ظالم بادشاہ جسنے ایران سے لیکر ہندوستان تک خون کا دریا بہا دیا لاکھوں انسانوں کو جانوروں کی طرح بیدردی و بیرحمی کے ساتھ ذبح کرا دیا شہروں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا انسانی آبادی کا مستقر جنگلی جانوروں کے رہنے کا ٹھٹ بگئی۔ ظلم و سفاکی سرو تعدی

خونریزی و خونخواری کا پیکر مجسم تھے۔ بے قصور انسانوں کو آپ اپنے
قتل پر مجبور کر دیا جسنے خواجہ جہاں کسانوں کو یہ کہکر تلوار کے گھاٹ اتار دیا
کہ ایں بیچارگاں را ازیں محنت خلاص کنید
وہ بھی موت کے سحر سے مذبح سکا دن بھر قتل و غارت کا نمائش
دیکھتا رہا رات کو اپنے حرم کے محافظ سپاہیوں کو یہ حکم دیکر سویا کہ صبح
تم آپ اپنی گردن مار دو۔ اگر اس سے پہلے حکم دے چکا تھا اور
اقبال مندی نے اسکو یورا کر دیا تھا لیکن اسکو کیا معلوم تھا کہ جو حکم اس نے
دوسروں کے قتل کا دیا ہے وہ اسی کا خاتمہ کر دیگا چنانچہ ان محافظین
نے تہیہ کر لیا کہ اس مصیبت سے دنیا کو نجات دینا چاہیئے اور نام
کے قتل و خونریزی کا تماشہ دیکھتا رہا اور اسکے بعد چار سو سپاہی
بے گناہ اور چاروں طرف سے پہرا رکھ کر سوا اسکے موت خواہ تلوار کی
مار ہو یا سروں کا اسکی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا چنانچہ ان چار
محافظین میں سے دو نے اس ارادہ سے مسموم ہو کر پھیر گئے اور
ایک درجہ تک جا کر واپس آیا لیکن جو تھا اندر داخل ہوا اور قتل کے
کہ تلوار سنبھالی اور تلوار کھینچ کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔
یہ وہی تلوار تھا جسکے شرم و آبرو کا حیف سی حد نہ رہے دلی کی گلیاں
جسکے خون سے گلنار ہو گئی تھیں لیکن آج اسکا مغرور و ہنر دسر

فٹ مال کی طرح تمام فوج میں پاؤں سے ٹھکرایا جا رہا تھا وہ فوج و لشکر
جو مادری حکم پر جان قربان کر رہا تھا آج اسکے سر کا تماشہ بنائے ہوئے
تھا۔ بیک گردش چشم سیلو فری نہ نادر نہ محامد نہ مادری

دنیائے اسلام میں مظلوم کربلا حضرت سیدنا امام حسنؑ کے بعد عبداللہ
ابن زبیر کی موت بھی بصائر و عبرت کا گنجینہ ہے۔
عبداللہ ابن زبیر قرن اولی کے ان چند مخصوص اصحاب میں سے
ہیں جنکو خداوند قدوس نے عقل و دانش فہم و ذکا تدبر و تفکر میں ممتاز
درجہ عطا فرمایا تھا۔ خصوصاً سیاسی تدبر میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا
معاویہ انکی طرف سے ہمیشہ خائف رہے چنانچہ مرتے وقت یزید کو
چند آدمیوں کی بسبب وصیت کی انمیں ایک عبداللہ ابن زبیر بھی تھے
انکی نسبت انہوں نے کہا تھا کہ اس پر اگر قابو پایا تو ہرگز مت چھوڑنا
ورنہ یہی شخص تمہاری سلطنت کو متزلزل کر دیگا۔
عبداللہ ابن زبیر نے معاویہ کے بعد ہی دعوت شروع کی ان کے
مقاصد کو کامیاب بنانے میں انکے بھائی مصعب ابن زبیر بھی برابر
کے شریک کار تھے چنانچہ بنو امیہ کی سطوت و جبروت کے باوجود
ابن زبیر کو اس قدر کامیابی ہوگئی کہ تمام حجاز اور عراق کا زیادہ حصہ

کچھہ ایران کی زمین پر ان کا قبضہ و دخل ہوگیا اور یہاں کے لوگوں نے
عبداللہ ابن زبیر کی بیعت کرلی۔ گویا قریب قریب سلطنت پر
قابض ہوگئے۔

لیکن ظالم کی رسی دراز خدا کو یہ منظور تھا کہ بنی امیہ کے مظالم و ستمگاریاں
حد سے گذر جائیں اور مظلوم کی بیکسی آخر نقطۂ مایوسی پر پہنچ جائے چنانچہ
عبداللہ ابن زبیر کی فتوحات کا سلسلہ ختم ہوگیا اور رجعت قہقری شروع ہوئی
مصعب مارے گئے اور تمام مقبوضہ ملک ہاتھ سے نکل گیا صرف مکہ معظمہ پر
ابن زبیر کا قبضہ تھا جسکو انہوں نے اپنی شہادت کے بعد ہاتھ سے جانے دیا
مصعب ابن زبیر کے قتل اور مقبوضات کے ہاتھ سے نکل جانے کے
بعد عبداللہ ابن زبیر مکہ میں قلعہ بند ہوگئے اور عبدالملک نے تیس ہزار لشکر
کے ساتھ حجاج بن یوسف ثقفی کو روانہ کیا اور ابن زبیر کو لشکر کے ہمراہ دس
سمت ایک امان نامہ بشرط اطاعت لکھہ کر حجاج کو دیدیا۔

حجاج جمادی الاولی ۷۲ھ کو کوفہ سے روانہ ہوکر طائف میں مقیم ہوا
اور وہیں سے وقتاً فوقتاً لڑتا رہا چند روز کے بعد حجاج نے عبدالملک
کو لکھا کہ عبداللہ ابن زبیر کی قوت بالکل گھٹ گئی ہے اگر آپ حکم دیں
اور میری امداد پر مدد کے لئے بھیجیں تو اسکا محاصرہ کرلیا جائے امیر عبدالملک
نے طارق کو حجاج کی امداد پر مامور کیا چنانچہ طارق مدینہ منورہ آیا وہاں

ابن زبیر کے گورنر کو معزول کرکے اپنا گورنر مقرر کیا اور پانچ ہزار سوار کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

حجاج اسکے آنیسے قبل احرام باندھ کر حدود مکہ میں داخل ہوگیا۔ اور بیر میمونہ پر قیام کیا مگر حج کیا نہ طواف اور نہ سعی کی اور نہ قربانی اور عبداللہ ابن زبیر کو عرفات میں داخل ہونیسے روک دیا مجبوراً انہوں نے مکہ ہی میں قربانی کی۔ حالانکہ ابن زبیر نے حجاج کو طواف و سعی بین الصفا والمروہ سے منع نہیں کیا تھا۔

اسکے بعد حجاج نے کوہ ابوقبیس پر منجنیقیں نصب کرائیں تاکہ مکہ پر سنگباری کرے اس سال عبداللہ ابن عمر حج کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے حجاج سے کہلا بھیجا کہ دور دور سے اللہ کے بندے اسکے گھر کی زیارت اور اسکا فریضہ ادا کرنے آئے ہیں انکو اطمینان سے حج و عمرہ کرنے دو اور اسکے بندوں کو اسکی عبادت سے مت روکو چنانچہ حجاج نے تمام انقضائے حج سنگباری موقوف کردی اور منادی کرادی کہ لوگ اپنے اپنے شہروں اور گھروں کو واپس چلے جائیں ہم ابن زبیر پر سنگباری کرینگے۔

اسکے بعد حجاج نے مکہ پر سنگباری شروع کرادی پہلا پتھر جسوقت خانہ کعبہ پر گرا تو آسمان سے ایک سخت خوفناک اور مہیب کڑک سنائی دی جس سے یہ اہل شام مرگئے اس واقعہ سے حجاج

لشکر میں خوف و ہراس طاری ہوا تو حجاج نے کہا کہ میں ابن تہامہ ہوں ڈرو نہیں یہ کڑک اور بجلی میری صبح کی خوشخبری ہے۔ اتفاق سے دوسرے روز بجلی گری اور ابن زبیر کے دو ہمراہی مر گئے۔

اسکے بعد حجاج نے جوش میں آکر خود مکہ معظمہ پر پتھر برسائے عبداللہ ابن زبیر کے آگے بڑے بڑے پتھر آکر گرتے تھے مگر وہ یکسر استقامت و مجسمۂ استقلال اسی حالت میں کھڑے نماز پڑھا کرتے تھے۔

عرصہ تک اسی طرح جنگ ہوتی رہی بالآخر محاصرہ کی طوالت سے غلہ کی کمی ہوئی رسد کا آنا بند ہو گیا غذا اسلئے قحط کی سختی ناقابل برداشت ہو گئی۔

عبداللہ ابن زبیر نے اس حال پر لوگوں کو قائم رکھنے کی غرض اور جوش پیدا کرنیکے واسطے ایسا گھڑا ذبح کر ڈالا اور اسکا گوشت تقسیم کر دیا اگرچہ عبداللہ ابن زبیر کے پاس غلہ اور کھجور کا ذخیرہ بہت جمع تھا مگر وہ عاقبت اندیشی کی وجہ سے نہایت کفایت شعاری سے حسب ضرورت تقسیم کرتے تھے۔

محاصرہ کو زیادہ طول ہوا تو ایک امان نامہ لکھکر بھیجا اس سے عبداللہ بن زبیر کے ہمراہیوں سے دس ہزار آدمی مخلصی حاصل کر لیں اور اس صبح ہم روزگار کو دیکھیے کہ خود حضرت عبداللہ ابن زبیر

دو بیٹے اسکے جدا ہو کر دشمن سے مل گئے جنکے نام حمزہ اور عمر تھے
البتہ تیسرا لڑکا باپ کی رفاقت آخر دم تک کرتا رہا اور عین معرکہ
قتال میں کام آگیا۔

اسکے بعد مختار نے فوج کو ایک تقریر کے ذریعہ جوش دلایا اور کہا
کہ اے بہادرو خونخوار اور آبرو کے میدانو نہیں پھیل جاؤ کیونکہ ابن زبیر
اب چند ساعت کے اور مہمان ہیں ابن زبیر کو اسکی اطلاع ہوئی تو
وہ اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا اے ماں! مجھے لوگوں نے دھوکہ
دیا اور ذلیل کیا یہانتک کہ میرے لڑکوں نے بھی مجھکو رسوا کیا۔
اگر میں چاہوں تو مخالفین مجھکو دنیا دے سکتے ہیں اب آپ کی کیا رائے
ہے؟ اسماء رام زبیر نے جواب دیا تم اس معاملہ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو
لیکن اگر تم حق پر ہو اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہو تو جو
کر رہے ہو کرتے رہو۔ اور اپنی کو دل اس کی میں نہ پھنساؤ کہ کوئی
امید کے چھوکر اس سے بہلیں۔ اگر تم نے دنیا حاصل کرنے کا قصد
کیا تھا تو تم نے اہل بیت کو بھی ہلاک کیا اور رسوا کیا۔
اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں حق پر ہوں اگر ہمراہیوں نے دھوکا دیا تو
سکوں کا کیا ہے اس زبیر نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ لوگ میرے قتل کے
بعد مجھکو مثلہ کرینگے اور صلیب پر چڑھائینگے۔

اسپر اسماء نے فرمایا اے میرے بیٹے! بکری جسوقت ذبح کردی گئی تو اسکو کھال کھینچے کی پروا نہ ہوگی۔ تم جو کچھ کر رہے ہو بصیرت کے ساتھ کئے جاؤ اسکے بعد ابن زبیر نے ماں کے سر کا بوسہ دیکر کہا میری بھی یہی رائے ہے۔ اسوقت تک نہ مجھے دنیا کی خواہش ہوئی نہ حکومت کی آرزو میں اس کام کے لئے صرف اسوجہ سے مجبور ہوگیا کہ خدائے تعالے کے اوامر کی بجا آوری نہیں کیجاتی اور اسکے مناہی سے لوگ احتساب واحتراز نہیں کرتے میں نے مناسب خیال کیا کہ آپ سے بھی مشورہ لیلوں۔ پس واقعہ یہ ہے کہ آپنے میری بصیرت زیادہ کردی۔

اور اے میری ماں! میں آج ضرور مارا جاؤنگا تم زیادہ مغموم ونخجیدہ نہ ہونا اور مجھے اللہ کے سپرد کردو۔ تمہارے لڑکے نے کسی فعل منکر کے ارتکاب کا قصد تک نہیں کیا اور نہ کسی امر مذموم وبدکاری کی طرف توجہ کی نہ اسنے بدعہدی کی ہے نہ کسی پر ظلم کیا ہے نہ کسی ظالم کا معین و مددگار ہوا ہے اور نہ اسنے حتی الامکان اللہ کی خلاف مرضی کوئی کام کیا ہے اے اللہ میں اس امر کو اپنے نفس کی برات کی غرض سے نہیں ظاہر کرتا بلکہ اسلئے کہ ایسی ماں کی تسکین خاطر کروں۔

اسماء بولیں مجھے امید ہے کہ اللہ تم کو اسکا اجر جمیل عطا فرمائیگا۔ تم اللہ کا نام لیکر حملہ کرو اگر تم فتحیاب ہوئے تو میں مسرور ہونگی اگرچہ

لڑائی پر جانیکی اجازت دیدی مگر ماں تھیں یا لاپروش کیا تھا یہ کس جی
سے ہوتا کہ موت کے منہ میں اپنے بچہ کو دیکر آپ گھر بیٹھ رہتیں کچھ
سوچیں اور سوچ کر فرمایا اچھا میں بھی تمہارا انجام کار دیکھنے چلتی ہوں مگر
ابن زبیر نے کہا آپ تکلیف نہ فرمایئے آپکو اللہ جزائے خیر دے البتہ دعائے
خیر سے مجھکو فراموش نہ کیجئے گا۔ ابن زبیر کے ان الفاظ سے محبت مادری
میں جوش آگیا تمام جذبات برانگیختہ ہوگئے دیکھ رہی تھیں کہ بیٹا مرنیکے
لئے جارہا ہے اسکے یہ الفاظ تیر کی طرح جگر میں پیوست ہوگئے بے اختیار
ہوگئیں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور لپٹ گئیں، یہ آخری پیار تھا
اور رخصتی کا آخری معانقہ اسکے بعد ابن زبیر بی ماں سے رخصت ہوئے
معانقہ کے وقت اسماء کا ہاتھ زرہ پر پڑ گیا۔ دریافت کیا یہ کیا ہے اور کس
لئے ہے۔ عبداللہ ابن زبیر نے کہا محض اطمینان و مضبوطی کی غرض سے
پہن لیا ہے۔ حضرت اسماء نے وہ زرہ اتاری اور معمولی کپڑے زیب تن
کرنیکے لئے فرمایا اسکے بعد ابن زبیر نے آستینیں کہنیوں تک چڑھائیں
قمیص کے دامن کمر سے باندھ لئے اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل کھڑے
ہوئے اور میدان کارزار میں پہنچ کر شامیوں پر سخت حملہ کیا اور
بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالا پھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ
تکبیر کہتے ہوئے ہجوم اعدا میں گھس گئے۔ بعض آدمیوں نے بھاگنے کی

راے دی مگر آپ نے فرمایا کہ برا ہی وہ شخص جو ایسی حالت میں بھاگ جائے۔ میں اللہ کے فضل سے دین اسلام میں ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ قتل کر دیا جاؤنگا سو اس خوف سے بھاگنا حماقت ہی اسوقت مسجد حرام کے تمام دروازے شامیوں سے بھر گئے تھے مکہ معظمہ کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ حجاج و طارق نے ابطح کی طرف مروہ تک محاصرہ کر لیا تھا اسی عالم میں ابن زبیر ادہر اُدہر حملہ کر رہے تھے۔

جب حجاج نے دیکھا کہ لوگ ابن زبیر پر حملہ کرنیسے جی چراتے ہیں تو سخت غصہ ہوا اور طیس میں آکر پیادہ پا لشکر لئے ہوئے ابن زبیر کے علم بردار پر حملہ آور ہوا لیکن ابن زبیر اس نرغہ میں گھس کر اپنے علم بردار کو نکال لائے اور سخت حملہ کر کے حجاج کو پسپا کر کے لوٹ آئے اور مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس درمیان میں پھر علم بردار پر حملہ کیا گیا اور وہ مارا گیا مگر ابن زبیر نماز سے فارغ ہو کر بغیر نشان و علم کے لڑتے رہے یہانتک کہ ایک ظالم و جفا کار کا تیر پیشانی مبارک پر آکر لگا جس سے تمام روے مبارک لہو لہان ہو گیا مگر آپ اس حالت میں بھی لڑتے رہے اسکے بعد دشمن دور سے تیر برسانے لگے اور ایسی سخت سنگباری کی کہ بالآخر آپ گھوڑے سے نیچے گرے اور شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ روز سہ شنبہ جمادی الثانی ۷۳ھ کو واقع ہوا

پھر حجاج کے سامنے انکا سر پیش کیا گیا اور اسنے عبدالملک کے پاس ایک نامہ بشارت کے ساتھ بھیجدیا۔ پھر لاش منگوائی گئی اور مقام حجون میں مثلہ کرکے صلیب پر چڑھا دی گئی۔

ابن زبیر کی ماں اسماء مقام حجون پر تشریف لے گئیں اور بیٹے کی لاش کو صلیب پر دیکھ ایک آہ سرد کھینچی اور ایسا دردناک مرثیہ پڑھا کہ پتھر کے دل و جگر پانی ہو گئے۔ اسماء نے حجاج سے بیٹے کی لاش مانگی کہ پھر دفن کریں مگر شقی القلب حجاج نے دفن کرنیکی اجازت نہیں دی۔

تم ابن زبیر کی دکھیا ماں کی حالت کا اندازہ کرو کہ اس بوڑھی بیوہ عورت پر کیا گذری ہوگی جسکا ایک بیٹا مصعب بن زبیر پہلے قتل ہو چکا ہے اور یہ دوسرا فرزند اسکی آنکھوں کے سامنے شہید ہوا اور اسکی بے سر کی لاش صلیب پر آویزاں ہے وہ اس دردناک نظارہ کو دیکھ رہی ہے مگر اتنی قدرت بھی نہیں کہ جسکو نو مہینہ تک پیٹ میں رکھا برسوں سینہ پر لٹایا گود میں کھلایا پھر بڑا ہوا شادی کی مگر اسوقت اسکی لاش تک نہیں چھو سکتی نہ کفن کا آخری جوڑا پہنا سکتی ہے نہ دو گز زمین کے اندر اسکو دفن کر سکتی ہے۔ بیکس و مظلوم عورت کا اسوقت کوئی نہیں کہ اسکے دکھ کو دور کرے۔ یہ عورت کون ہے؟ یہ رسول اللہ ؐ کی

بھاوج ہے حضرت زبیر کی پھوپی ہو جو رسول اللہؐ کے پھوپی زاد بھائی تھے مگر یہ امتیازات آج اسکی کچھ مدد نہیں کر سکتے وہ جگر افگار بیٹے کی لاش کے لئے تڑپ رہی ہو مگر کوئی نہیں جو اسکی یہ آخری و مختصر تمنا پوری کر دے۔

ممکن ہے تم اس غریب و بیکس عورت کو بدنصیب کہو کیونکہ اس عورت سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگی جسکے ایک چھوڑ دو دو بیٹے قتل کر دیئے جائیں اور وہ انکی لاش تک کے لئے ترسے لیکن نہیں تم یہ لقب دینے میں عجلت نہ کرو۔ ایسی خوش قسمت بھی دنیا میں کم ہوگی جیسی ابن زبیر کی بوڑھی ماں اسماء تھی۔ اس کا دل نور ایمان سے منور تھا وہ حق و صداقت کی پرستار تھی وہ اس امر پر راضی ہوگی کہ اس کا فرزند ظلم و عدوان کا مقابلہ کرے اور تمرد و سرکشی کو دنیا سے برباد کر دے اور اگر راہ الٰہی میں شہید ہو جائے تو اس پر صبر کرے۔ اس کا فرزند ہمت و جرأت الٰہی کے نور اکرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ ضلالت و گمراہی دور کرنے کے لئے اس نے اپنے تئیں مہالک و خطرات میں ڈالا اور بالآخر خدائے اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔ پھر ایسی مائیں کہاں اور ایسے فرزند کس کو نصیب ہوتے ہیں۔ موت نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا مگر ایسا خاتمہ کہ

قیامت تک کے لئے حیات جاوید کا خلعت عطا ہوگیا اور نہ صرف صفحہ تاریخ پر بلکہ مسلمانوں کے قلوب پر اس کا دوام ثبت ہوگیا۔

عبداللہ ابن زبیر شہید ہوگئے ان کی لاش صلیب پر لٹکائی گئی اور حجاج نے وہ سب کچھ ظلم کر ڈالے جس کے ذکر سے انسانیت شرماتی ہے مگر نہ حجاج رہا نہ اس کے مظالم نہ اس کی ستمگاریاں ہیں نہ اس کا آقا عبدالملک باقی ہے سب فنا ہوگئے سب برباد ہوگئے موت نے مقتول کی طرح قاتل کا بھی خاتمہ کردیا اور مظلوم کی طرح ظالم بھی موت کے بے اماں حربہ سے نہ بچ سکا۔

عبدالملک اپنے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ، شام و روم و مصر و افریقہ عراق و ایران حجاز و عرب کا مالک تھا سیکڑوں کو پھانسی دیدی لاکھوں کے سر تن سے جدا کردئے سیکڑوں عورتیں بیوہ ہوگئیں ہزاروں بچے یتیم ہوگئے مگر جب وقت آگیا تو ساری طاقت طاق تھی نہ زور و قوت کچھ کام آیا نہ فوج و لشکر نے ساتھ دیا نہ شوکت و عظمت نے بچایا موت کا فرشتہ آیا اور ایک مگس انسان کی طرح اسکی روح کو بھی قبض کرلیا۔

عرصہ ابن زبیر کا فرق مبارک عبدالملک کے پاس بھیجا اور لاش کا حال معلوم ہوا کہ حجاج نے دفن کی اجازت نہیں دی تو وہ بہت

خفا ہوا اور حجاج کو سخت ملامت کی اور لاش کے دفن کرنیکی اجازت دی
عبداللہ ابن زبیر موت کے فلسفہ سے واقف تھے وہ اس سے بیزار
اور اسکو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے انکو معلوم تھا کہ موت آئیگی اور یقینی
آئیگی اسلئے حیات مستعار کو اس طرح اسکی سپرد کرنا چاہیئے کہ دوسروں
کے لئے دلیل راہ اور خود میرے لئے باعث فلاح ہو۔ چنانچہ انھوں
نے اپنی زندگی حق و صداقت کے قرباں گاہ پر چڑھا دی۔ پھر دیکھو کہ
موت انکی دوست بھی یا دشمن۔

---

۷۸۶ دل کی تین بطیں خاص رسالہ "کم ٹو موت" کے لئے سری جواہر سے آگرہ کے شہرہ آفاق
سحر البیان شاعر جناب مولانا سیماب نے لکھی ہیں لیڈر کی موت میں انھوں نے
حالات و واقعات کا بے ساختہ آئینہ دکھا دیا ہے اور بکری کی موت کا بیان ان کے
دل درد آشنا کی تصویر ہے جس کا ہر شعر ابن آدم کا دامن گیر ہے۔ تاکہ وہ سمجھے
کہ بقائے حیات کے لئے جو غذائیں اسکے پیٹ میں جاتی ہیں وہ کن مصائب کے
پیمانوں سے گزر کر آتی ہیں۔
شہزادہ دارا شکوہ برادر اکبر سلطان عالمگیر بادشاہ عاری کا تذکرہ شہادت نہایت
الم ناک ہے۔ اور اس سے دولت و حکومت کے نشہ رکھنے والوں کو بہت عبرت
ہوگی۔ اور ایسا انجام یاد آئیگا مگر واقعات قتل میں جناب سیماب نے یا تو شاعرانہ مبالغہ سے

باشہرت عام کی بنا پر چند باتیں خلاف تاریخ لکھ دی ہیں اورنگ زیب نے دارا کی آنکھیں نہیں نکلوائی تھیں نہ دارا کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ بھائی کے قدموں پر سر رکھتا۔ اسکو جس حالت میں قتل کرایا گیا۔ اور دھلی دروازہ پر مدتوں اس کا سر لٹکا رہا۔ (جیل دہلی کے سامنے والی سڑک دہلی دروازہ مراد ہے موجودہ شہر کا دہلی دروازہ نہیں)

حسن نظامی

۸۶ ایک لیڈر کی موت

یہ فرشِ رنج پر اک لیڈر پڑا ہوا ہے — ہونا ہی جسکو راہی ساعاتِ متصل ہیں
ہر آں یاس اسکے سوحسرتوں کا جمگھٹ — کچھ دلوں ہیں جی ہیں کچھ حوصلے ہیں دل ہیں
کچھ کامیابیوں کا دھندلا سا ہی تصور — ہیں کچھ ندامتیں بھی آثار منفعل ہیں
وہ انہماک قومی، وہ انصرامِ ملّی — جذباتِ حوس آگیں وہ طبع مستقل ہیں
چندوں کے وہ بکھیڑے، وہ حسرتِ صدارت — وہ ایڈریس حوانی اجلاسِ منفصل ہیں
نشترزنِ تخیّل ہے واقعاتِ رفتہ — پیدا ہوئی چمک سی ہر زخم مندمل ہیں
سوچا کہ کاش کرتا کچھ سعیٔ آخرت بھی — ہوتا نہ یوں تجاوز اوقاتِ معتدل ہیں
یہ وقت ہی کہ طلبی سرکار میں ہی میری — جاتا ہے ریگا مجکو مطرب کی کونسل میں
اعمال کی جو پرسش ہوگی تو کیا کہوں گا — حوتِ حالیاں ہی کیا ہیں اس آبِ خجل میں

ہیں چند سانس باقی اور وقت واپسیں ہے
لیڈر پھنسا ہوا ہے افکار مضمحل میں

دم مارنے کا موقع اب ہمدمو نہیں ہے
حقّے یہ بھر کے رکھیئے گو بار بار چلمیں

غفلت میں ہے تو خوش ہے ہشیار ہے تو نادم
ہے انقلاب کیسا انساں کے آب و گل میں

کر لو جو کچھ ہو کرنا، سر پر قضا کھڑی ہے
ایسا نہ ہو کہ حسرت رہ جائے دل کی دل میں

۷۸۶ ایک بکری کی بے کسانہ موت

دنیا کا یہ عبرت کدہ کس درجہ عبرت خیز ہے
ہر واقعہ درد آفریں، ہر حال حسرت خیز ہے

حلوہ نمائی کس قدر ہزاروں آبی ہیں
جو مٹ گئے ہیں کس کے ایسے گھر ہزاروں آبی ہیں

انساں ہی اس میں تنہا تکار یکسی
ہیں جانور بھی آئے دن سینہ فگار یکسی

یہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں سی ہی تتلیاں
یہ گائیں بھینسیں اور بھیڑیں مرغیاں اور بکریاں

پامال ہو جاتی ہے ہستی ان کی انساں کیلئے
برباد ہو جاتی ہے بستی ان کی انساں کیلئے

فطرت کا ہے یہ قاعدہ فطرت کا یہ قانون ہے
انسان ہی کے نام سے ہر جانور معون ہے

مرتا ہے دنیا میں کوئی بھی کسی کے واسطے
اور جانور مرتے ہیں اس کی زندگی کے واسطے

حسرت مگر ان ہو ہو جو بیکسی اور بے
افسوس اس لوحہ جس کا ساز بھی نہ ہو

یہ بے کلم اپنی موت سے چارہ کے آگے ہے کھڑی

دو چھوٹے چھوٹے بازو ہیں بیٹے بھی اسکے پاس ہیں
بکری کی ہیں یہ زندگی، اور اسکے دل کی آس ہیں

اپنی زباں سے جاتی ہے جو سی ہے وہ ٹھیں
کھوٹے کے جاروں سمت لیکر گھومتی ہے وہ ادھیں

اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب اک بار اسکی آنکھ سے
ہوتے ہیں جاری آنسوؤں کے تار اسکی آنکھ سے

الفاظ باد اسکو ہیں فریاد وہ کیونکر کرے
اپنی زباں میں شکوہ پیدا وہ کیونکر کرے

کہتی ہے "میں" یعنی کہ میں صبر اور مجبور ہوں
بچے جو مجھ سے دور ہیں آرام سے میں دور ہوں

سنتا نہیں لیکن کوئی فریاد اس مجبور کی
کرتا نہیں کوئی دوا اس کے دل رنجور کی

وہ سامنے بچوں کے اپنے ذبح ہوتی ہے اگر
رہ جاتے ہیں بچے اشاروں سے کلیجہ تھام کر

قصاب رسی کھول کر جب دم گراتا ہے اسے
بچوں کی تنہائی کا عالم یاد آتا ہے اسے

گردن اٹھا کر دیکھتی رہتی ہے انکو بار بار
کر ڈالتی ہے ذبح اسکو گوکھری کی تیز دھار

کہتی ہے "میں" یعنی کہ بچو نسے ہوتی ہوں جدا
میرے یتیمو ہو تمہارا حافظ و ناصر خدا

دردِ یتیمی یاد جب بچوں کا آتا ہے اسے
اور وہ ان کا خون کے آنسو رلاتا ہے اسے

ہوتا ہے ایسا بھی کہ بچے اکثر اسکے سامنے
ہوتے ہیں ذبح بیکسی مر مر کے اسکے سامنے

حالت یہ انکی دیکھکر سودائی ہو جاتی ہے وہ
رسی تڑا اسکے لئے بے طرح گھبراتی ہے وہ

بچوں کو اپنے خون میں آلودہ دیکھ دیکھکر
مجبور رہ جاتی ہے وہ مجبور، اوپر دیکھکر

جب ذبح ہونے کے لئے انکا ہلاتی ہے وہ
تو سنگھتی ہے جاتی ہے اور چلاتی ہے وہ

بیدرد انساں کو مگر احساس کچھ ہوتا نہیں
اشکیں بڑی رہتی ہیں اسکے سامنے روتا نہیں

ہوں اسکے بچے ذبح گر اسی طرح کے سامنے
یہ بیٹھ جائے تھام کے دل آہ بھر کے سامنے

بکری کی لیکن بیکسی اُس پر اثر کرتی نہیں
بے جارگی پیدا کبھی دردِ جگر کرتی نہیں

کیا ہو نہیں سکتا نہ لائے بچ کر بیکسی کے لئے
بچوں کے آگے ماں کو اور بچوں کو ماں کے سامنے

کیا ہو نہیں سکتا کہ ہو حساسِ حالِ بیکسی
ہونے نہ دے اس طرح اکو یائے مالِ بیکسی

ہونے کو ہو سکتا ہی، جو چاہے کرے لیکن یہیں
موت آئے اور لائے نہ رنگِ بیکسی ممکن نہیں

کہتے ہیں جسکو سے کسی وہ موت کی تصویر ہی
فطرت کا منشا ہی یہی، انساں کی کیا تقصیر ہی

۸۸۶ دارا کی موت

بقا نصیب نہیں عالمِ فنا کے لئے
دو روز جینے کی خاطر نہ مر خدا کے لئے

مسافروں کو یہ فطرت کا عام ہی اعلان
قیام کچھ یہیں اس کاروانِ سرا کے لئے

ملی کسی کو یہاں عمرِ جاوداں نہ کبھی
کسی نے لطف ہمیشہ یہاں نہ آ کے لئے

بنائے سدِ سکندر رہوئی بہت مضبوط
مگر نہ روک سکا لی گئی قضا کے لئے

بقا کسی کو میسر نہیں زمانے میں
نہ بادشہ کے لئے ہی نہ ہی گدا کے لئے

حیاتِ خضر کی حالت جو ہو گئی معلوم
تو آبرو نہ رہی چشمۂ بقا کے لئے

چمن رہیگا نہ باقی چمن کی شادابی
یہ سب بہار ہے دو روز کی ہوا کے لئے

جہاں ہو چین سے رہنا یہ وہ مقام نہیں
کہ دو گھڑی سے زیادہ یہاں قیام نہیں

وہ شاہزادۂ عالی تبار دوالا باہ — جو روشنی تھا ہر اک دیدۂ ولا کے لئے
تھا قصرِ شاہ میں دارا شکوہ جسکا نام — جو فخر و ناز تھا احباب و اقربا کے لئے
کنیزیں بیسیوں تھیں جسکی ہم جلیس انیس — حسین سیکڑوں تھے ایک تقا کے لئے
تھی اسکی ٹھوکروں سے گرتی ہوئی دولت — نواسکے ہاتھ گھر بار تھے عطا کے لئے
تھا اُسکے پاس زر و مال اور لال و گہر — کچھ انتہا ہی نہ تھی جنکی ابتدا کے لئے
پھر انقلاب تو گردش میں آگئی قسمت — وہ سعی کرتا تھا اورنگ کے بہا کے لئے
خدا نے بھائی کو اُسکے جو کامیاب کیا — تباہی آگئی اس دردآشنا کے لئے

عجیب قسمت دارا میں انقلاب آیا
کہ بیٹے کا خطِ تقدیر کا جواب آیا

بلایا بھائی نے جب تخت کے ہاتھ آیا — ملا نہ وقت بھی کچھ عرضِ مدعا کے لئے
دیا یہ حکم کہ آنکھیں نکال لو اس کی — سزا یہی ہو فقط اپنے ناسزا کے لئے
سلاخ لوہے کی اور وہ بھی آتش افگندہ — پھر اُسپہ یہ کہ کسی حیثیم سرمہ سا کے لئے
نکالیں ظلم سے قاتل نے سر گئیں آنکھیں — رہیں نظر میں گجائیں حیا کے لئے
ہوا یہ دوسرا پھر حکم اُس کے بھائی کا — کہ سر بھی اسکا جھکے جورِ جفا کے لئے
وہاں تو صرف بہانہ تھا اک ستم کا — تم ہی ٹوٹ پڑا جان مبتلا کے لئے
قدم پہ بھائی کے دارا نے رکھ دیا سر کو — کہا کہ بھائی مجھے چھوڑ دے خدا کے لئے

ہوئی مگر نہ سنوائی نہ التجائی کی
سُنی نہ بھائی نے آخر یکار بھائی کی

پھر ایک در پہ لٹکوا دیا سر دارا — کہ ہو تماشہ عبرت مِن و شما کے لئے
یہ حال اُن کا ہے جو صاحب حکومت تھے — نصیب جن کا تھا یاوس خاکپا کے لئے
جب اُنکے ساتھ یہ قسمت نے نارسائی کی — تو پھر کہاں ہے مفر اور اغنیا کے لئے
نہ کام آئی حکومت، نہ منصب شاہی — نہ مال و زر دیا ساتھ اُن کا اُنکے لئے
اگر ہے چشم بصیرت تو ہے عیاں یہ بات — ثبات کچھ نہیں دہر بے وفا کے لئے
ہر ایک نفس کو جگہی ہے موت کی لذت — ہزار ہاتھ اُٹھا کر دعا کرے لئے
دعا ہے سارا زمانہ، دعا ہے آخر کار — دعا جو ہے تو فقط داد کبریا کے لئے

رہیں گے پھول یہ پھولوں میں رنگ و بو باقی
رہے گا اے مرے معبود ایک تو باقی

موت

آہ تیرا نام لیتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے طبیعت ہر ایک کام سے بیزار ہو جاتی ہے اور ایک دفعہ ہُو کا عالم ہو جاتا ہے۔ اے موت تو کیا ہے؟ تیرا کیا کام ہے؟ کہاں کہاں تو منزل پر پہنچانے کے لئے رہتا ہے تیرا کام ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانا ہے۔ اے موت تو ہر جگہ ہے تیری حکومت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے نو خشکی اور تری اور جنگل اور صحرا سب جگہ موجود ہے، کوئی بادشاہ سے بغاوت کر سکتا ہے

ہر تیری حکومت ایسی ہے کہ تعاون کیا بلکہ کوئی شخص بھی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا بادشاہ تو اپنی ہی قوم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے پر تو ہے کہ سب پر نظر یکساں ہے نہ تو کوئی امیر اپنی دولت کی وجہ سے رہائی حاصل کر سکتا اور نہ غریب اپنی غربت سے بچ سکتا ہے۔ تو عجب بہروپیہ ہے کہ ہزاروں شکلوں میں اپنے شکار کے روبرو جلوہ نما ہوتی ہے کبھی تو سانپ کبھی ہیضہ اور کبھی کیا کبھی کیا بن کر آدمی کی روح کو اس کے قفس عنصری سے کھینچ لیتی ہے چاند ستارے آفتاب وغیرہ اپنے معین وقت پر نکلتے ہیں سب کا ایک وقت ہے لیکن تیرا اے موت کوئی وقت نہیں تو وقت کی پابندی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتی ڈاکٹر اور حکیم تیرے کام میں خلل ڈالتے ہیں لیکن واہ رے موت! تو ان کو بھی نہیں چھوڑتی دنیا میں شاید ہی کوئی مخلوق ایسی ہو کہ تیری چاہنے والی نظر آئے۔ ایک شخص اپنی گاڑی چلا رہا تھا راستہ میں بہت کیچڑ ہونے کی وجہ سے اس کا پہیا اس میں دھنس گیا وہ نامرد بغیر کوشش کئے خداوند کریم سے اپنی موت کا خواستگار ہوا کوئی نوجوان شخص وہاں سُن رہا تھا اسکے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ تو کیا چاہتا ہے اُس نے کہا کہ میری گاڑی کو باہر نکال دے وہ شخص بہت ہنسا اور کہا کہ ابھی تو موت چاہتا تھا اور ابھی مدد۔

اُف - موت! تو نے کیسے کیسے پری جمالوں کو گور کی تاریک و تنگ کوٹھری میں سُلا دیا کہ پھر کروٹ لینے کا نام ہی نہیں - ہائے جن کے محلوں میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی آج انکو تن تنہا رکھ چھوڑا ہے - آہ اس بچہ کو جسنے ماں کی گود سے کبھی بھی بیچ سے تک نہ رکھا نوئے گود سے زبردستی چھین کر خاک کے ڈھیر میں چھپا دیا - اُف ایسے ایسے امیرزادے جن کو پھول کی سیج پر بھی جلد نیند نہیں آتی تھی وہ بھی خاک پر ایسے بیخبر سوئے ہیں کہ حاگنا قسم ہے - ہاں اگرچہ تجھ سے سب کوئی گریہ کرنے ہیں لیکن تو نہ ہو تو پھر زندگی کا لطف نہ ہو اور دنیا میں تمام عیش سُست ہو جائیں - اے موت تجھے تو اس باغ دنیا سے ایسا پھول توڑنا چاہیئے کہ جس کی پتّیاں اپنی سال پیمائی کی وجہ سے پژمردہ ہو چکی ہوں نہ کہ وہ کلی جو ابھی کھلنے بھی نہ پائی ہے اور ہزاروں آنکھیں جس کے جلوہ کی امید میں مصروف نظارہ ہوں -

گورستان - یہ وہ جگہ ہے جہاں موت یاد آجاتی ہے - ہر چہار جانب جو زمین اُٹھی ہوئی ہے اس میں تمام دہقان مٹی کے غلاف سے اپنے آپکو پوشیدہ کر کے ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ باد صبا اور صبح کی اذان بھی انکو بیدار نہیں کر سکتی - ہائے اس میدان میں کیسے کیسے نوجوان اور پری جمال تن تنہا اپنے اپنے حجرہ میں پناہ گزیں ہیں اور ان لوگوں کا

دیکھنے والا سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔ اے زمیں تو بڑی رحیم ہے اور تو شاہ و گدا کے ساتھ ایک ہی سلوک سے پیش آتی ہے

از نظام المشائخ محمد جنید سلیم پوری

موت اکبر کی نشانی

یہ خوابگاہ اُس بادشاہ جلال الدین اکبر کی ہے جو رجب ۹۴۹ھ میں ستت یکشنبہ کو بطن حمیدہ بانو بیگم زوجہ نصیر الدین ہمایوں سے پیدا ہوا تھا اور جسے ۱۳ سال ۸ ماہ ۲۷ دن کی عمر میں تاج و تخت پایا تھا۔ ۱۲ شعبان جمعہ کو آگرہ سے پیادہ پا اجمیر شریف ہو کر دہلی واپس آیا تھا۔ اور دہلی سے شکار کھیلتا ہوا ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ روز چہارشنبہ کو آگرہ میں آکر رہبر ملک بقا ہوا۔ یہ مادر روضہ جلال الدین اکبر نے اپنی حیات میں بنوا کر بہشت آباد نام رکھا تھا۔ دروازہ روضہ کا اس قدر بلند کہ عنقائے نظر ایسی بے پر و بالی و نارسائی سے محجوب۔ یہاں باغ بھی ہے سنگ مرمر کی جالیاں اور پھول بوٹے اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایسے ہیں گویا مصوّر نے صفحۂ قرطاس پر گلہائے سرسبز کی جھاڑیاں بنائی ہیں۔ اوپر کا تعویذ سنگ مرمر کا محض زیارت گاہ عام ہے اور نود و نہ نام اُس پر کندہ۔ نیچے کے تہ خانے میں وہ اصلی تعویذ ہے جنہیں وہ جلیل القدر بادشاہ تنہا سو رہا ہے جو کل قلعۂ سرخ

اولیائے اقلیم ہند کا مالک تھا۔ ہائے نہ سہرا نے اسکے آج کوئی شمع ہے نہ وہ فیضی
و ابوالفضل سے عالی مرتبہ ندیم و ہمنوا (مخمس عرس بر سفر وداع)

ایک چادر کفن کی جسکو اوڑھے ہوں پڑا — اب نہ وہ ہمدرد و ہمدم ہیں نہ کوئی دوسرا
کس سے پوچھوں وہ طلسم رنگ دنیا کیا ہوا — زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جدا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا

اے اجل نہ قہر یہ غضب کہ تو نے ایک مجھے کیا کہ سارے زمانے سے
جلال الدین اکبر سے رنگین طبع علم دوست بادشاہ کو چھین لیا۔ اور چھین کر
اک ایسے تاریک قید خانے میں بند کر دیا جہاں کسی طرح ہم نہیں جا سکتے
آہ۔ ماتو وہ وقت تھا جب اکبر قلعہ سرخ کے عالیشان دروازہ سے
شان شاہانہ کے ساتھ نکلتا تھا یا آج وہ وقت آیا ہے کہ اسی دروازہ سے
اسکا حسرت بھرا جنازہ نکل رہا ہے۔ ہے ہے عشق کا دم بھرنے والی انیوں کا
واویلا آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور زبان عبرت پر مومن کا
یہ نوحہ ہے کہ

مدفن بنے زمین حمیں و اصیبتا — معدوم ہو وہ غنچہ دہن و اصیبتا
دے منکر و نکیر کو ناچار وہ جواب — جو حور سے کرے نہ سخن و اصیبتا
جسکو تحسین دل عاشق عذاب ہو — وہ اور جانکنی کے محن و اصیبتا
تسلیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب — ملجائے خاک میں وہ دہن و اصیبتا

دیتے تھے عروش بھی جس آرام پہ جان
اُس کا غم ہلاک شدن و مصیبتا

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ
عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

از نظام المشائخ دہلی

۷۸۶

یادِ اجل

میں اے اجل ہوں تیرا امیدوار کب سے
تیری مفارقت میں ہوں بیقرار کب سے

ہے میری جان آحماں تجھ پہ نثار کب سے
کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے

مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سب نذر گا ہوں میں

اے پُر زناز نخوت اے آن بان والی
اے غم فروش عالم - اے حی و کان والی

اے صاحب رعونت سر تر نسان والی
شرم و حیا کی دیوی شاہانہ شان والی

جاں تیرے خیر مقدم کو رک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اوستگر

اے موت بند ہستی سے تو چھڑا دے مجکو
آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجکو

صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجکو
آ حجرۂ لحد میں چل کر سلا دے مجکو

اے قہر موت ہی سے ہے دل کا اک امان
آ عورتوں دل میں لیلے شفقت تیری قربان

میں ہوں فقط اکیلا کچھ مال ہو نہ رہو
دو گز کا اک کفن ہو کچھ لینے پاس گہنا

کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو
شادی کی کچھ خبر ہو غم کا نہ کچھ اثر ہو

وہ دن کب آئیں گے احباب پیارے ہوں گے
ہم اپنا منہ لپیٹے بے فکر سوئے ہوں گے

غربت کی ہو نہ یرا دولت کی ہو نہ حاجت
عزت کی ہو نہ خواہش ذلت سے ہو نہ نفرت

اعدا سے ہو نہ کینہ یاروں سے ہو نہ الفت
اولاد کی محبت ماں باپ کی چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت
مکار بے حمیت بد چشم بے مروت

تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت
ہے بیوفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے اماں جو مانگے آنکھے گلے لگے تو
جو دل سے تجکو چاہے اس سے الگ رہے تو

ارسطام المتلئ

سکندر کا جنازہ

مشعل بزم حکومت فاتح روئے زمین
والی بابل سکندر نامور شاہ جہاں

چھوڑ کر ساز طرب جب اہی عقبیٰ ہوا
آرزوئیں رہ گئیں سب ہاتھ ملتی ماں کی یاں

نعش یوں تابوت زریں میں رکھی احباب نے
جس طرح دُرِ صدف میں ہو دُرِ یکتا نہاں

بزم ماتم کا محب عبرت فزا یہ سین تھا
گرد تابوت سکندر سب کے سب تھے نوحہ خواں

بھر کے آہِ سرد بولا اک حکیم نکتہ سنج
مرنے والو مرنیوالے کیلئے کیوں ہو فغاں

ہے مقدم اور موخر کا یہاں بعد و فراق
در رہ جانیکو اہی منزل سے ہے ہر کارواں

رہرو ملک عدم کا ہے مگر نقش قدم
ساکن معمورۂ ہستی کو عبرت کا نشاں

وائے حسرت مرگ نے مجبوں اس کو کر لیا
کل جو اپنے دشمنوں کو قید کرتا تھا یہاں

ہائے سلطان کا ہے جسم بیجاں ناظرین
جسکے قدموں سے لگی تھی صبح و نصرت عرش تک

نکتہ سنجو! تم میں کچھ بھی حس عبرت ہے اگر — نذرِ غم نقدِ تخیل اب کرو مرحوم پر

حکیم ثانی نابوت پر ہاتھ رکھ کر :-

سیم و زر صندوق میں جو بند رکھتا تھا کبھی — آج خود وہ سا معم ساکن نابوت ہے
زندگی سے فخر کر کچھ عالم اسباب کو — کاہلی بھی آدمی کے واسطے اک موت ہے
جی سکندر کی طرح اور مر سکندر کی طرح — ذکر رہ جائے ترا گھر گھر سکندر کی طرح

حکیم ثالث

جائے عبرت ہے جو کل عالب تھا سب پر آج وہ — ہو گیا مغلوب کیسا بیکسی کے ہاتھ میں
سرکشوں کو ضعف جسکے عہد دولت میں رہا — رگ رگ لیاں کر رہے ہیں وہ خودی کے ساتھ میں
موت کر دیتی ہے کیسی ایک دم کایا پلٹ — نیستی سے سارے استحکام ہو جاتے ہیں ہٹ

حکیم رابع

یہ وہ صالط تھا حال مرگ کو جسنے نہاں — دل کے پردہ میں رکھا اور آرزوئیں آشکار
پھر قضا کو کیوں نہ ٹالا اور کچھ دن کے لئے — تاکہ بر آتی تمنائے دلی بے اختیار
در رہ امیدوں کو رکھا چاہیئے تھا مختصر — دست تر موت سے تاکہ نہ ہوتیں سوگوار
عمر کھوتا ہے ستر امید ماحق کے لئے — چشم وار کھتا ہے شوق دید ماحق کے لئے

حکیم خامس

کشتۂ فکر و تردد میری سعی ناسپاس — کا نتیجہ بعد تیرے کھل گیا یعنی کہ یاس
احتیاج ماسوا نے عمر بھر رکھا ذلیل — جس فانی کا نزد و عارضی تھا تیرے پاس
مارِ غم نے جسکے بجھ سے بیوفائی کی صریح — اور حاصل اس کا لاحاصل گیا ہوں کا ہراس

غیر کا حصہ ہوا سرمایۂ ہستی ترا — اور حواب عصیاں کا ایسے آپ تو دینے چلا

حکیم سادس

ایک مجھ پر قصا تو ناصح مشفق بھی تھا — باد ہیں اکثر تری ہم کو نصائح دلپذیر
تیرا مرجانا مگر ہے آج اک بیدلیع — زندگی نے اسی عبرت خیز کب دی بھی خبر
تو سراپا پند خاموشی ہے سب کے سامنے — ختم عبرت آج عبرت کا تماشا دیکھ لے

حکیم سابع

کل تری تقریر سے مجلس میں اکثر تھے حریں — چاہتے تھے جلد تو خاموش ہو جائے کہیں
آج ہے اُنکو نہ نالوں اُٹھنے کی ترے — اور تو جیکا ہے یوں گویا ماں سمجھ میں نہیں
اُٹھ گئی مُہرِ خموشی کیوں لب اعیار پر — کیوں نہیں جلدی ہے مصرار یاں اسا رہ

حکیم ثامن

ہر سے صد کتنی جانیں اسماں میں ہیں — تو رہے زندہ سلامت اور ترا عزو جاہ
ح سکا لیکن نہ تو دسے اجل کے تیر کی — آخرش مر ہی گیا اے جان عالم آہ آہ
اک سطح پر خادم و مخدوم دونوں آ گئے — ہاں ترا دو جانِ جاناں جان کھو کر آ گئے

حکیم تاسع

حکم ہے مجکو نہ دم بھر کو میں تجھ سے جدا — لیکن اب تجھ تک رسائی کی نہیں پاتا ہوں راہ
میں ابھی قائم ہوں اپنے عہد پر اور تو نہیں — میرے آقا کیا یہی ہوتا ہے وعدہ کا نباہ

حکیم عاشر

کم نہیں دن طلوع صبح محشر سے ہمیں — جب تلک ہستی عالم ہے رہے گا یادگار

جا بے جاتے اج کے حرمان و غم پھر آگئے
آیوالی برکتیں اس دن کی لوٹیں سوگوار

ہے لہدا مژدۂ عبرت ہر ایسی آنکھ کو
جو زوالِ سلطنت پر ہو کسی کی اشکبار

آج روئے شاہ اور شاہی کا منظر دیکھکر
تخت کا مالک پڑا ہے تختۂ تابوت پر

ارا سوہ حسنہ میرٹھ
انوار حسن رسوا

سکندر کا تابوت حلقۂ فلاسفہ میں

نتیجہ فکر سان الہند حضرت عزیز لکھنوی

شہر بابل میں سکندر کے کیا جب انتقال
حلیے تھے والستۂ دولت ہوا ان کو ملال

دود سور غم دلِ اربابِ دولت سے اٹھا
صبح ہوتے ہی جنازہ شان و شوکت سے اٹھا

چھا گیا وابستگان دامنِ دولت کا غم
ابر تیرہ بن گیا سلطان کی فرقت کا غم

ہو گیا تیار تابوت مرصع زر نگار
رکھ دیا پیکر سکندر کا یتیم اشکبار

یوں حکیماں اولوالعزم آئے ماتم کیلئے
تھے کسا وہ سب کے سینے ماحسن غم کیلئے

بیچ میں تابوت تھا اور گرد تھے حلقہ زن
ایک اُن میں سے ہوا اس طرح گرم سخن

بولے معلوم اک زمانہ کو کہا ای بادشاہ
موت کو مغلوب کر سکی نہ نکلی کوئی راہ

دوسرے نے پھر کیا تابوت شاہی سے خطاب
اے حدیث معدلت گستر ستہ گردوں رکاب

تیرا حصہ میرا غبط اک موت تھا اے شہنشاہ
موت پر آیا نہ حصہ تجھکو کیوں اے بادشاہ

تیسرے نے عرض کی اے بادشاہ نامدار
چلتی پھرتی چھانو تھی نہ ہستی بے اعتبار

ہاتھ رکھ کر عرض کی چوتھے نے تابوت سے
کتنی جلد اٹھا ہی تو اس مجلس ناسوت سے

صحن عالم میں جو کل تک تھی ترے زیر نگیں
سات بالشت اب سمٹ کر رہ گئی ہے وہ زمیں

یا نخوت سے عرض کی اے بادشاہ ماہ و ماہ
تو نصیحت ہمکو کرتا تھا جہاں میں بار بار

اے سکندر لیکن اب واحسرتا عبرت ہو گئی
آج مرنے سے ترے پوری نصیحت ہو گئی

کی جھٹکے سے عرض جو کل تک مطیع رام تھے
ہیبت شاہنشہی سے رعشہ بر اندام تھے

آج ہیبت سے تری کوئی جمیدہ سر نہیں
سامنے تیرے کھڑے ہیں مطلق انکو ڈر نہیں

ساتواں بولا کہ تھی میری جدائی ناگوار
آج ہیجوں کس طرح تجھ تک نہ آئی تھی پکار

آٹھویں سے عرض کی دیکھو یہ حشم اعلیٰ
ایک دم میں مٹ گیا اس دبدبے والے کا دبدبا

کی نویں نے عرض حب دنیا کا یہ انجام ہے
ترک اس کو پہلے ہی کر دیجیے میں آرام ہے

عرض کی دسویں نے اے عالم سے نکو کیوں بھول
تنگ ظرفوں میں ترے اس وقت دنیا کیوں بھول

تجھکو اس ملوت میں جا موت کیوں پائے ہیں ہم
جا دیواری میں شہروں کی ترا گھٹنا تھا دم

روح نے چھوڑا ہے کتنی جلد جا کی قفس
یوں گئی تنہا ہی تری جس طرح اڑتی ہے مگس

خلق مشتاق زیارت اور تو رویوں ہے
گوش بر آواز دنیا اور تو خاموش ہے

کیوں نہ رکھا تو نے امیدوں کو اپنا مختصر
دستبرد موت سے ہرتا نہ تجھکو کچھ خطر

بستیاں آباد تھیں جتنی وہ ویران ہو گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے خواب پریشاں ہو گئیں

امیر کی موت اور فقیر کی موت

دولتمند جو مرتا ہے
روتا ہے اور غم کرتا ہے

ہائے میں دسا جھوڑ چلا ا | مال سے ناطہ توڑ چلا ا
اور حقیر کو کیا ڈر ہے | مرنا جیسا برابر ہے
خالی آئے چلے خالی | پچھلوں کا اللہ والی
ہے یہ نبی کا فرمودہ | مَوْتُ الْفُقَرَاءِ رَاحَۃٌ

زندگی کی ہچکیاں

۷۸۶

حضرت اکبر الہ آبادی کی قلم سے

کتاب کم ٹو موت تیار ہو چکی تو مجھے اتفاقاً خیال آیا کہ اس میں لسان العصر وحدان الملتہ حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کا کلام کچھ نہ لکھا گیا حالانکہ انکی تحریریں عبرت و نصیحت کی جان ہیں۔

ارادہ ہوا التماس نامہ تحریر کر کے کچھ منگاؤں مگر دل نے کہا ان کو حوادث ایام نے رو رو کر کی علالتوں نے اور کبر سنی نے فرمائشوں کی تعمیل سے اوجا کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں تکلیف دینی مناسب نہیں۔

اُٹھ کر الماری میں سے کلیات اکبر حصہ دوم نکال لی۔ اور اس کو سرسری نظر سے دیکھا تو حسب ذیل اشعار تھوڑی دیر میں نکل آئے۔

سالہا سال سے میں یہ کرامت کلام اکبر کی دیکھ رہا ہوں کہ جب کبھی کسی خاص مضمون کے لئے کلیات اکبر کو دیکھا تو ایسے شعر فوراً مل گئے گویا وہ میرے ہی مقصود کے واسطے لکھے گئے تھے۔

ناظرین ملاحظہ کریں کہ یہ اشعار کم تو موت کے مقصود کے کس قدر موافق ہیں گویا اگر اور مضامین اس کتاب میں نہ ہوتے اور صرف یہی منتخب اشعار لکھ دیئے جاتے تو میرا مقصود حاصل ہو جاتا اور دلوں پر ہر پہلو سے موت کی حقیقت طاری ہو جاتی ہیں نے اس کتاب میں مختلف حالتوں کے نظارے موت کے متعلق دکھائے ہیں اگر ان اشعار کو غور سے پڑھا گیا تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مجموعہ اشعار میں کوئی شعر ایسا نہیں جو مضامین شعر کے کسی نہ کسی حصہ کا عنوان بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو

کاش اس وقت میرے پاس کلیات اکبر کا حصہ اول بھی ہوتا اور اس کا انتخاب بھی اس کتاب میں آسکتا۔ شاید خدا تعالیٰ آئندہ ایڈیشن میں یہ توفیق اور موقع عنایت فرمائے۔

حسن نظامی

زندگی کی چمک سے دیدۂ عبرت ہے بند — کم نظر ہے جانب گورِ غریباں دیکھنا
ہے او دلیوش[1] لس اک تفسیر العالمین — کاش اس کتنے دامن مسلماں دیکھنا
سن علیہا فان ہے یہ حتم ہے قولِ ٹسٹ[2] — کیوں عبث ریا ہے اتنا شور طفلاں دیکھنا

جنکے جلوے نہ سما سکتے تھے ایوانوں میں — اُنکی خاک آج پڑی پھرتی ہے ویرانوں میں
کاش بے ہوش کو الجھایا ہے افسانوں میں — آنکھ نے دل کو پھنسا رکھا ہے ارمانوں میں

---

[1] ارتقا [2] مسودہ تاریخ اشعار

جانتے ہیں کہ اجل سر پہ کھڑی ہے لیکن
محو ہیں انجمنِ دہر میں جو تن بیٹھے ہیں

عقل حیراں ہے پروانوں کی اس حالت پہ
شمع کو جس میں یہ جاں دے دیتے ہیں

جا رہا ہوں میں کہ خواہش موت کی اچھی ہے
زندگی بے لطف ہو جائے مگر تو کیا کروں

کتنی باتیں بہم اس دور فنا میں ہو چکیں
ابتدائیں کتنی راحل انتہائیں ہو چکیں
سوچ تو دل میں تو اے مصروف حال صبح و شام
کتنی صبحیں ہو چکیں اور کتنی شامیں ہو چکیں

کسی کو یاں نقاہیں کوئی سدا رہا ہیں
یہاں کا رنگ ہی یہ ہے ہمیں تو کچھ گلا ہیں
عرور تھا مو دھتی - ہٹو بچو کی سی صدا
اور آج ہم سے کہا کہوں لحد کا بھی تیا ہیں

آرزو مرگ کی تم کرتے ہو اکثر لیکن
سوچ لو قبر میں آرام ملے گا کہ نہیں

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا
اُس لئے وجہ سے کم رکھتے ہیں لبیں کے ساتھ

پیچیدہ زندگی کے کرو تم مقدمے
دکھلا ہی دے گی موت نتیجہ نکال کے

دلکش صدائے صور تو ایسی نہ تھی مگر
تعظیم حسرت کے لئے سب اٹھ کھڑے ہوئے

تیر رفتار نہ ہو اس قدر اے موج فنا
تجھ میں کچھ قطرے ہوا سے ہیں ابھی ڈرنے والے

کیوں نہ لوں نام خدا اس بت کی صورت دیکھکر
لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہیئے

کیسے کیسے زرنگار ایواں ملے ہیں خاک میں
ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے

ہوں ہوں سوق سے دنیا کے قصوں کو مگر
دیکھیئے رہا جو جسم داستاں تک ہو سکے

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کر خوب دیکھا

سکھ ملا جسکو رہا ہے میں مبارک ہو اسے
ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا
مطمئن ہو کے لگا ماہوں لحد میں بستر
اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

فرقت یار میں جینے کا سہارا کیا تھا
خوب ہی موت سوا موت کے چارا کیا تھا
جان اللہ سے لی جسم ہوا داخل گور
ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا — اب گرد رہ گئی ہے یہ میلا نکل گیا
موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آگئی — نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا — کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی کرنے کے سوا
موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے تعلیم تھی — کچھ نہیں آتا خدا سے ڈرنے کے سوا

برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا؟ یہ کہئے — روح رواں نے ایسے دامن کو جھاڑ ڈالا

خود دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقیں آیا — اُسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

جاں ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی — موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئیگا — خدا کا نام لئے جاؤ کام آئیگا

غالبؔ خاتمہ بالخیر سمجھ لو اس کا — جسکے مرنے کا نہیں رو دستی سے غم نہ کیا

قبروں سے دوستوں کے بھرے ہیں سو اُتھر — لوں کیسے نام روؤں میں کس کس نشاں پر

ہر وطرہ اور وزہ ہی مورت حوادث — دفتر ترا کہاں تک زہ رقم کہاں تک
تحصی ہوں حواہ قومی سب جائیں ہیں فانی — کبر و غرور کب تک جاہ و حشم کہاں تک
کہتے ہیں دوست اکثر کو دیکھ کر حسرت — ہی اس کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

عاقلوں کو جلوہ ہستی بہار عید ہے — چشم ملیا ہیں مگر یہ سحر کی تمہید ہے

خوشی ہی سب کو کہ آیرتن میں خوشتر ہی عیل رہا ہے — کسی کو اس کی خبر نہیں ہی یہ مرض کا دم نکل رہا ہے
یہ دیکھے ہو جو کاسۂ سر غرور غفلت سے کل تھا چھلو — یہی ہی ناز سے پلا تھا آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جسکی ملبغ سمجھے نظر ہو جسکی وسیع دیکھے — ابھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں آج قلزم ابل رہا ہے

اکبر مریض ہے تو دعا بھی اسے سکھاؤ — ایسا نہ ہو کہ صرف دوا ہی کا ہو رہے

دم بھر میں جسم و روح کا قصہ تمام تھا — مٹی میں مل گیا وہ یہ ایسے وطن گئی

دنیا میں ہی مست اثر نغمہ کس ہی — یہ دیس میں ہی روح مگر دیس کی دھن ہی

دنیا کیلئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آ ایک طرف — اب تہر خموشاں عالم ہو مٹی ہی لحد کا کونا ہی

روتے ہیں دوست میری لاش پر اے احتیاط
یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اسکی جان لی

اجاگر ہیں کل تحت پتھے کر نیست کی تمنا وہ بھی
اللہ کی قدرت یہ بھی ہے اللہ کی قدرت وہ بھی

حسرت میں ختم ہو گئی اتنائے زندگی
حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی
اس زندگی سے عود ہی کیا ہے تجھے اسیر
تجھکو یہ کیوں ہے سوق و ہمائے زندگی

جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

عنوان ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے
آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دکھیں
اٹھے جو ہیں بگولے برباد ہوں گے تن کے
گو بحر بہت ہے اس میں فرہاد بکھیں گے
ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبد کہن کے

شمع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں
حسرت کہتا ہے مالی جائے گی
زندگی کی کل ہے بیچیدہ تو حیسر
سانس لے لے کر چلا لی جائے گی

جس کو تقا نہیں ہے وہ دلکشا ہی ہے
جس کو فنا نہیں ہے اس کا بیا ہی ہے

مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی — مصیبت بڑی رو کے جب ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز ریست — سُلایا شبِ گور نے سو رہے

دوزخ کے داخلہ میں نہیں اُن کو عذر کچھ — فوٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے — بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی بھر مر گئے

سنتا ہوں قبر مری ریل میں آ جائیگی — خود مٹا ہوں جب اسی راہ میں مٹی بھی سہی

زندگی بھی ہے مصیبت موت بھی رہا ہے — کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہے دین ہائے
ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی سازش دیکھئے — اُن کا فوٹو لیتے ہیں ٹیر ہے ہیں سین ہائے

سناؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے ناصد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ — وہ جھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی — مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے — تو ہیتک جہنم بھی ہے کوئی سے

نقش ماضی منتظر بے سعی و مفہوم ہے — مصلحت فطرت کی ہے یا ذہن کا مقسوم ہے
بہ رہا ہے لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحر فنا — ورد کے قابل فقط یا حیّ یا قیّوم ہے

نہ پھیلایا ہوں تو اتنا حیاتِ چار روزہ میں — سمجھ لے قبر میں تیرے لیے جا صرف دو گز ہے

ابھرا ہے رنگ سودا دیوانگی ہری ہے — ہے جوشِ موسمِ گل جو پھول ہے ہری ہے
سمع اور تیغ سے ہے ہر صبح وعظِ عبرت — یہ بھی مرے پڑے ہیں وہ بھی سُنی ہری ہے

روح کا بیجا سات سے ٹراسائیں ہے — اس لیے ہادیِ دیں مطلوب حق و اس ہے

یہ جو ہنگامۂ تزئینِ عیش و کامرانی ہے — تماشا غافلوں کا آج ہے کل اک کہانی ہے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے — دوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

---

۷۸۶ عزت کو موت

موجودہ زمانہ میں خود مختار بادشاہ صرف چار تھے۔ اور ان چاروں کی عزت آسمان کا تارہ بنی ہوئی ساری دنیا میں چمکتی تھی مگر خدا تعالیٰ نے

دکھا دیا کہ اس عزت کو بھی موت آیا کرتی ہے اور عزت کے طلبگاروں کو
اس انجام سے ڈرایا کہ جنکی عزت میں کروروں آدمی جھکے ہوئے تھے
جب وہ آن کی آن میں ملیا میٹ ہو گئی تو تم اس خالی عزت کی طلب
میں آخرت کے اعزاز ثانی کو کیوں بھولے جاتے ہو۔

موت ہر حیر کو آتی ہے اور عزت کی موت سب موتوں سے بڑھ کر دردناک ہے
کیونکہ عزت کی خاطر انسان جان دیدینی گوارا کر لیتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے

حشمت مٹے جلال مٹے گر دیر مٹے — مال و منال سارا مٹے تا کہ رہ مٹے
سب جائیں مٹ [illegible] — اور آبرو کے جیسے سب سال رہ مٹے

لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عزت فقط خدا کی ذات کو سزاوار ہے۔
آدمیوں کی عزت خاک و مٹی سے بڑھ کر ہے۔

دیکھا ان دو چار سالوں میں لگا مار کیسی کیسی

عزتوں کے تاج تاراج

ہوئے ہیں سب سے پہلے سلطان عبدالحمید خان والی ترکی معزول ہوئے
ان سلطان کی وہ ہیبت اور شوکت تھی کہ تمام دنیا انکے نام سے کانپتی تھی
اور یورپ میں اس تاجدار نے تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ لاکھوں آدمیوں کی جان
اس ایک سیکر خاک کے ہاتھ میں تھی مگر جب خدا نے اپنی قدرت کا تماشا
دکھانا چاہا اور عزت کی [illegible] کرنے اور عزت طلب لوگوں کو عبرت
دلانے کا ارادہ کیا تو لمحہ سکنڈ میں ادھر کی دنیا اُدھر کر دی۔ اور سلطان

عبدالحمید خاں تاجور سے ایک معمولی قیدی بنا دئے گئے۔ جو آج تک گمنامی اور بے عزتی کی قید میں چپ چاپ پڑے ہیں۔

دوسرے عزت دار راج یوش شاہ ایران تھے۔ انکی عزت بھی خاک میں مل گئی۔ اور چند پرجوش نوجوانوں نے انقلاب کرکے بادشاہ کو نکال دیا اور اسکے بیٹے کو جانشین کرکے پارلیمنٹ قائم کردی۔

تیسری بے عزتی چین کے حکمراں کی ہوئی۔ جو ہزاروں برس سے کروروں آدمیوں پر گویا خدائی کر رہا تھا مگر اس عزت کی اجل بھی آئی اور انقلاب نے اسکو گور میں دفن کردیا۔

چوتھی عزت زار روس کی تھی جو یورپ و ایشیا کے دو عظیم الشان حصوں پر نہایت دبدبہ اور خود مختاری سے سلطنت کر رہا تھا اور جسکی عزت کا آفتاب انقلاب کی سیاہ گھٹاؤں سے بھی چھپا نہ تھا۔ کیونکہ عزت کی موت کا وقت آیا تھا۔ لیکن مارچ ۱۹۱۷ء میں یہ منحوس گھڑی آگئی اور اس نے ذرا سی مہلت بھی علاج کی نہ دی۔ جس سے وہ اپنی عزت کے مرض کا علاج تو کرسکتا۔ مرگ ناگہاں جس کا نام ہے وہ اس شہنشاہ اعظم اور اسکی بیگم کو برداشت کرنی پڑی۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ مملکت وسیع روس کا ایسا شہنشاہ تھا جسکے اشارہ حتم پر سر خم ہوتے تھے اور ایماء ابرو پر جانیں آرام پاتی تھیں۔ جسکی ہاں اور جسکی نہ پر لاکھوں کروروں جیسے کے فوری فیصلے

محصر تھے اور جسکی طرف بڑے بڑے بادشاہوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں
مگر ایک گھنٹہ کے بعد وہ ایک قیدی بن گیا۔ اور مجرموں کی طرح ایسے
غلاموں کا حکم سنا پڑا۔ اسکی شہنشاہ بیگم نے نہایت بے کسی اور غریبانہ
عاجزی سے یاس و ہراس کے یہ جملے کہے۔

"اب میں محض ایک اماں ہوں۔ اور بیمار بچوں کی حفاظت کر رہی ہوں"
یہ اس عورت کے الفاظ ہیں جسکے حکم سے لاکھوں بچوں کو یتیم کرا دیا تھا
جسکی مرضی سے بے شمار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔

کس کی مجال تھی جو زار روس اور اسکی بیگم کی خوابگاہ میں دراہ چلا جاتا
مگر آج ان دونوں کو قیدیوں کی طرح قبل از وقت بیدار کیا جاتا ہے
اور جانوروں کی مثل ہانک کر مقام نظر بندی پر پہنچایا جاتا ہے۔
اور یہ غریب کچھ نہیں بول سکتے اور یہی کہتے ہیں کہ ہم تمہارے
ہر حکم کی تعمیل کو تیار ہیں۔

اے انسان عبرت پکڑ اس انجام سے۔ [illegible] آدمی ڈرنا اکی گرفت سے
غرور کر عزت پر اترا [illegible] کہ ایک [illegible] موت آیا کرتی ہے
اور ایک وقت [illegible] حاہ و جلال [illegible] کرتے ہیں۔

[illegible] سکاں سے چلے [illegible] گور میں ہیں پڑے
[illegible] جہاں [illegible] گل ہے [illegible] عار مالکل تھے

جن جس میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس [illegible] یار کرم
مطربی کا جو سلسلے تھے — [illegible]
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — [illegible]
ذات معبود جاودانی ہے — [illegible]
صبحدم طائران خوش الحان — [illegible]

۷۸۶ ٹائٹک جہاز کی اجل

کئی برس ہوئے یورپ میں ایک جہاز بنایا جس کا نام ٹائٹک تھا اس جہاز میں ایسے آلات اور ایسی چیزیں لگائی گئی تھیں جو ڈوب نہیں سکتیں۔ اور یورپ کے ہر عاقل شخص کو یقین تھا کہ یہ جہاز کسی طرح پانی میں غرق نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سے بڑا جہاز تھا۔ اس میں دنیا کے عیش کا سب سامان فراہم کیا گیا تھا اسکو اہل عقل کی کارگری کا سب سے بہتر نمونہ سمجھا جاتا تھا یہی وہ جہاز تھا جسکے گھمنڈ نے انسانوں کو دریا کے خطروں اور موت کے اندیشوں سے بے پروا کر دیا تھا۔

حضرت نوحؑ کے طوفان پر جنکو یقین نہ تھا۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کی نجات پر جو ایمان نہ لاتے تھے۔ عالم اسباب کی مدد سے موت کا مقابلہ کرنے اور اس پر فتح پانے کا جنکو غرہ تھا وہ سب حیران رہ گئے جب انھوں نے

اخباروں میں یہ پڑھا کہ ٹٹانک جہاز ایک برف کے ٹکڑے سے ٹکرا کر آناً فاناً
میں ڈوب گیا اور اسکے بڑے بڑے نامور مسافر موت کے گھاٹ اتر گئے تھے
ص میں انگلستان کے مشہور اخبار پرواز میسٹر اسٹیڈ ایڈیٹر ریویو آف ریویوز بھی
سمندر میں قدرتی برف کی ایک چٹان تیرتی پھرتی تھی۔ رات کے
وقت جہاز اس سے ٹکرایا۔ مسافر بے خبر پڑے سوتے تھے۔ ان کو جگایا
گیا۔ کہ اٹھو جہاز ڈوبتا ہے اور موت آتی ہے۔ تو انہوں نے جھلا کر جواب
دیا جھوٹے ہو یہ جہاز قیامت تک نہیں ڈوب سکتا۔ اس میں اس قسم کے
آلات لگے ہوئے ہیں جو کمالات سائنس کی بہترین یادگار ہیں اس
جہاز کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ تم مکومت۔ جاؤ سونے دو۔
مگر وہ بھر ایسے سوئے کہ اب شاید قیامت کو بیدار ہونگے۔ ٹٹانک جیسے منٹ
میں غرق آب ہو گیا اور عقل پر گھمنڈ کرنے والے اپنے بستروں پر پڑے
ہوئے دم گھٹ گھٹ کر مر گئے۔
جب موت آگئی تو انہوں نے دیکھا کہ زندگی اور موت خدا کے قبضہ میں تھی
انسان بالکل بے بس تھا۔ اور ہماری بڑی بھول تھی جو ہم نے خدا کو چھوڑا
اور اسباب مادی پر بھروسہ کیا۔
قدرتی برف سمندر کے کھاری پانی میں غوطے کھاتی تھی۔ اور وہ آدمی جو
بجلی کی روشنیوں میں ہوٹلوں کے اندر بیٹھ کر شیشہ کے گلاسوں میں سوڈا

برف ہلا ہلا کر پیا کرتے تھے۔ آج وہ خود سمندر کے گلاس میں برف اور سوڈا واٹر (آب سمندر) میں مل کر اس تنکے کی طرح جھٹکے کھا کھا کر دم توڑ رہے تھے جسکو کبھی کبھی انہوں نے گلاس میں دیکھا تھا اور خان سامان پر خفگی ظاہر کی تھی۔

حسن نظامی

بادشاہوں کا وقت آخر

سلطان محمد تغلق نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو حالت نزع میں استعار ذیل موزوں کئے تھے ؎

بسیار دریں جہاں جمیدیم — بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند برنشستیم — ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر — چوں خاستِ ماہِ نو جمیدیم

رقعہ شہنشاہ عالمگیر (اورنگ زیب) جو بحالت مرض سام شاہزادہ اعظم شاہ لکھا گیا تھا۔

سلام علیکم و علی من لدیکم پیری رسید و ضعف قوی شد۔ قوت ارعضا رفت۔ یگانہ آمدم و بیگانہ می روم۔ خبر از خود ندارم۔ کہ کیستم و چہ کارہ ام نفسے کہ بے ریاضت رفت افسوس آں باقی ماند۔ مالگذاری و رعیت

پروری، هیچ ازمن نیامد۔ عمر عزیز از دست رفت۔ خداوند در خانه دارم
و دوستانی آن در سیتم تاریک خود می بینم۔ حیات پائدار نیست و از
نفس رفته نشانے یدیدار و ارا استقبال هم ترفع مفقود دوست، حادثه
کرد و حرم و یوست تنها گذاشت۔ فرزند کام بحق اگرچه به هیچ بود رفت
اما نزدیکی ست و آن عالیجاه اران هم نزدیک تر۔ عزیز الدولت شاه عالم
از همه دورتر فرزند زاده محمد عظیم بحکم الله العظیم بر دیگر هندوستان
رسد و لشکریان همه بے دست و پا و هراسیده یوس مقطعت که از خداوند
تنهائی گزیده در حالت اضطراب ست و چون سماع سفر ارمی فهمد که صاحب
نعمتی داریم۔ هیچ ما خود سیاه دروم و تمره گناهان همراه می برم امیدوارم که
درجه عقوبت گرفتار خواهد شد هر چند نظر بر الطاف و رحمت امید قوی
است اما نظر بر اعمال و افعال تفکر می گذارد ع

هر چه ما دادا ما دا ما کشتی در آب انداختیم

اگرچه از خود رفته را فکر می ماند اما چون عالم دل تنگی است همه را بحدا می
سپارم حیات بندگان اگرچه پروردگار خواهد کرد لیکن نظر بر عالم ظاهر بر
فرزندان هم ضرور است که خلق الله و مسلمین ناحق کشته نه شوند۔ فرزند زاده
بهادر را دعای آخرین گوید وقت رخصت بدیدم۔ اشتیاق باقی ماند
بیگم بظاهر اگرچه ملول است لیکن مالک دلها خدا است۔ کوته اندیشی

موشات جُز ناکامی ثمرہ ندارد۔ الوداع الوداع الوداع۔

ترجمہ

سلامتی ہو اور تمہارے اور اُس کے جو تمہارے ساتھ ہو۔ بڑھاپا آیا اور کمزوری کی زیادتی ہوئی۔ اعضا کی قوت جاتی رہی۔ تنہا ہی آیا تھا اور تنہا ہی جاتا ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کون ہوں اور کس کام کا ہوں۔ جو دم ملا یا والی گذرا [illegible] مالگذاری رعایا پروری کچھ مجھ سے نہ ہو سکی اور عمر عزیز مفت برباد ہوئی۔ اللہ تعالیٰ میرے گھر میں موجود ہے مگر اُس کا نور میری چشم کور (اندھی آنکھ) نہ دیکھ سکی۔ زندگی ناپائدار ہے۔ دم گذشتہ کا کوئی نشان باقی نہیں نہ آیندہ کی امید باقی ہے قوت نے گوشت و کھال کو تنہا چھوڑ کر مفارقت کی۔ مٹیا کام بحق اگرچہ بیجاپور پہنچ گیا مگر قریب ہے اور تم اس سے بھی زیادہ قریب ہو عزیز القدر شاہ عالم (بہادر شاہ) سب سے زیادہ دور ہے فرزند زادہ (یونا) محمد عظیم بحکم اللہ العظیم ہندوستان کے قریب پہنچ گیا۔ کل فوج بے دست و پا یرلیتان اور میری طرح مضطرب اور سیماب وار (پارہ کی طرح) بیقرار ہے۔ نہیں سمجھتے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ میں کچھ ایسے ساتھ نہیں لایا تھا لیکن گناہوں کا بوجھ ایسے سر پر لئے جاتا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کس عذاب میں گرفتار ہونگا اگرچہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و

مہربانی قوی اور اُس پر نظر ہے لیکن اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے فکر نہیں جاتی۔ جو کچھ بھی ہو ہو (اللہ مالک ہے) میں نے ناؤ دریا میں ڈال دی ہے۔

اگرچہ ایک خود رفتہ کو کسی کا کیا خیال ہو سکتا ہے لیکن چونکہ دنیا عالم دلبستگی ہے لہذا تم سب کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ ایسے بندوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کریگا لیکن بعالم ظاہر فرزندوں پر لازم ہے کہ مخلوق خدا اور مسلمانوں کے کشت و خون کا باعث نہ ہوں۔ فرزند زادہ [illegible] کو آخری دعا لہو۔ رخصت کے وقت نہ دیکھنے کا اشتیاق باقی رہا [illegible] اگرچہ بظاہر بیدرد ہے لیکن دل کا حال خدا جانتا ہے۔ عورتوں کی کوتاہ اندیشی [illegible] ناکامی کے کوئی ثمرہ نہیں رکھتی۔ رخصت رخصت [illegible]

ترجمہ رقعہ عالمگیر بادشاہ بنام شاہزادہ محمد کام بخش بوقت نزع [illegible] جگر بند من جہاں تک میرا اختیار تھا میں نے نصیحت اور وصیت کی لیکن چونکہ خدا کو منظور نہ تھا کسی نے نہ سنا۔ اب کہ میں بیگانہ جانا [illegible] تمہاری بے بضاعتی پر رحم آتا ہے۔ لیکن بے سود ہے میں نے کچھ عذاب و گناہ کیا اس کا پھل اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں یہ عجیب بات ہے کہ میں دنیا میں آیا تو تنہا تھا لیکن جانا اس قافلہ کے

ساتھ ہوں۔ سوائے خدا کے مجھے کچھ لطف نہیں آتا۔ لشکر اور لشکریوں کا خیال اور بھی موجب ملال اور وبال آخرت ہے۔

مجھے اپنی کچھ خبر نہیں ہے۔ میں نے بہت سے گناہ کئے ہیں نہیں معلوم کس عذاب میں مبتلا ہوں گا۔ مخلوق کی نگہبانی اگرچہ رب العالمین خود کرے گا لیکن مسلمانوں اور فرزندوں پر بھی واجب ہے۔

جو کچھ ضروری تھا تمہارے حق میں کہا گیا اس کو دل و جان سے سطور کرو ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا کشت و خون ہو اور اس کا وبال میری گردن پر عائد ہو۔ تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور خود رخصت چاہتا ہوں۔ اضطراب کی حالت ہے۔

سعید احمد مارہروی

۷۸۶

ستاہی محل میں دم توڑنے والی نورجہاں کو دیکھنا بہ فلاکت زدہ ایرانی امیر کے گھر میں اسوقت پیدا ہوئی کہ وہ بیابان کا مسافر نان شبینہ سے محتاج مارا مارا ہندوستان آرہا تھا۔

ہوش سنبھالا تو شاہزادہ جہانگیر ابن اکبر شاہ بادشاہ کی محبوب نظر ہوئی اسی وجہ سے شیر افگن خاں گورنر بنگالہ سے بیاہ کر کے پایۂ تخت سے دور بھیجدی گئی۔

اکبر مرا - جہانگیر تخت نشین ہوا - تو نورجہاں شہنشاہ بیگم بنی - ہند میں سونے چاندی کے سکے اسکے نام پر چھپے اور شہنشاہ نے دو کباب اور ایک پیالہ شراب کے عوض سلطنت اسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی -

یہ وہی نورجہاں ہے جو ایک جیب حساب کو ہنان میں پیدا ہوئی تھی اور ماں نے اسکو جنگل میں اکیلا ڈال کر آگے کا راستہ لیا تھا یہ وہی نورجہاں ہے جو اکبر کے شاہی باغ میں کنڈی تھی جہانگیر کی نگاہ پڑی تھی بھول پن سے اسی نے کبوتر ہاتھ سے اڑا دیا تھا

یہی وہ عورت ہے جسکی خاطر شیر افگن خاں جہانگیر کے ہاتھوں مارا گیا - اسی دم توڑنے والی نے سلطنت ہند کے داعیہ داروں کے دم خم توڑ کے رکھ دیئے تھے - طوطی کی طرح چہکنے والی - بلبل کی مثل بولیاں بولنے والی - بزم شاہانہ کی شمع رزم رستمانہ میں شیروں کی مانند آگے بڑھ کر گرجنے والی - اسی کی تدبیروں نے بڑے بڑے عالی دماغ حکمرانوں کے جوڑ توڑ کو نیچا دکھایا تھا - یہی دریا کے کنارے ایک عظیم الشان لشکر سے تیر کمان ہاتھ میں لیکر لڑی تھی - یہی ہے جسکے گلے میں سونے کا طوق اور ہاتھ پاؤں میں طلائی ہتکڑیاں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں - پھر وہی یہ ہے جس نے تلوار کے منہ سے اپنی جان بچا کر حریفوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا -

آج اسکی موت آئی ہے

آج اس نے سفر آخرت پر کمر باندھی ہے اب کوئی تدبیر۔ کوئی لطیفہ کوئی سحر۔ کوئی نگاہ ناز کوئی سحر تیر اسکی جان کو پنجۂ اجل سے بچا نہیں سکتا۔

دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ چھپ پر نگاہیں ہیں۔ دل میں آہیں ہیں سر کا وارث نورالدین جہانگیر بادشاہ خاک میں جا سویا۔ شاہ جہاں جو ساری عمر نورجہاں کی آنکھوں میں کھٹکا سریر آرائے سلطنت ہو۔ مدتوں کے رنڈاپے کے بعد آج موت اسکی زندگی مانگنے آئی ہے۔

نورجہاں سوچتی ہے۔ میں کسی بدنصیب تھی اسوقت کہ مصیبت کے ایام میں پیدا ہوئی اور ماں باپ نے صحرا میں اکیلا ڈال دیا۔ اور کسی خوش قسمت تھی اس وقت کہ میری بدولت ماں کی نوکری ہوئی پھر باپ کو امیری ملی۔ اور کیا زمانہ تھا۔ وہ۔ کہ مجھ پر جوانی نے طلسم کا غازہ ملا تھا دنیا کی ہر شے مست نظر آتی تھی۔ میں چلتی تھی تو پیروں تلے خلقت کے دل مسلے ہوئے۔ رومدے ہوئے کچلے ہوئے پاتی تھی نرگس کو دیکھتی تو اسکو شرما کر گردن جھکاتا ہوا خیال کرتی۔ اور مجھ کو گھمنڈ ہوتا کہ اس پھول سے میری چشم بیمار کی دید برداشت نہ ہو سکی گل لالہ پر نگاہ جاتی۔ اسکے داغ دار سینہ کو دیکھتی تو جی الہڑپن سے

کہا کہ شاید میری فرقت نے اس کا سینہ داغ دار بنایا ہے۔ یا میری طرح کسی اور حسین پر اسکا بھی آیا ہے۔

چمن میں سرو شمشاد کے سایہ تلے جاتی تو اپنے قد رعنا کی زیبائش پر آپ ہی آپ اترا لی۔ اور کہتی۔ مجھ سے زیادہ نہیں ہیں یا اونچے ہیں یا نیچے ہیں۔

ہوا چلتی۔ پھولوں کی ڈالیاں جھومتیں تو میں کہتی۔ انکو تو ہوا جھکاتی ہے۔ مجھ پر کیا بلا آتی ہے کہ چلتے چلتے جھکی پڑتی ہوں اندر کوئی چیز ہے جسکے بستہ سے بے قابو ہوئی جاتی ہوں۔

میں وہی نور جہاں ہوں رستمی صبا کے دامن کھینچی تختہ چمن پر ہری گھاس کو اسی شوخ ٹھوکروں سے ٹھکراتی۔ سوتے فتنوں کو جگاتی دبی قیامت کو اٹھاتی جا رہی تھی۔ سامنے سے شہزادے ولی عہد کبوتر ہاتھ میں لئے تشریف لائے۔ آداب کو جھکی شرم نے بھی جھکایا۔ جوش شباب نے نظروں کو نگاہوں سے ملایا۔ وہ دم بخود ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں بے اوسان ہو کر پیچھے ہٹی۔ نہ اُن کا قدم آگے بڑھا اور نہ میرا قدم پیچھے ہٹ سکا۔ آخر وہ بولے۔ اور کہا۔

لڑکی میرے کبوتر لیلے۔ میں اتنے ذرا پھول توڑتا ہوں۔ میں نے بسر و چشم کہا۔ مگر کیونکر کہا۔ دل کا اس وقت کیا عالم تھا۔ آج اس کیفیت کو

کیونکر تصور میں لاؤں - اب وہ وقت ہی نہیں رہا۔
ایک کبوتر پھڑک کر اُڑ گیا۔ شہزادے واپس آئے۔ اور بولے۔
ہائیں میرا کبوتر کیا ہوا۔ میں نے عرض کی۔ صاحب عالم۔ اُڑ گیا۔
بولے کیونکر۔ میں نے ہاں شاید میں نے ہی۔ بہت سادگی۔
بہت بھول پن سے دوسرے ہاتھ کا کبوتر اُڑا کر کہا۔ جناب اس طرح۔
شہزادے پھر چپ ہو کر۔ اور کچھ دیکھ دیکھ کر۔ اور ایک ہلکا سا
سانس لیکر۔ جس سے میں نے گرمی خنکی اور سب ہی کچھ محسوس کیا
اُلٹے پھرے۔ اور محل کی طرف بڑھے۔ میں کھڑی رہ گئی۔ میری بر آ
ہوا گلاب کی شاخ کا سر ہلاتی تھی۔ بے تاب پتیوں کو فرش خاک پر
گراتی تھی میں نے دل کی ایک نامعلوم حالت سے بے چین ہو کر
برگ گل کو دیکھا۔ مگر شاید کچھ نہ دیکھا۔ میری آنکھوں پر ایک خمار نے
پردہ تان دیا تھا۔ ابھی میں اپنے ہوش کی اس نیرنگی پر غور کرنے
نہ پائی تھی۔ ابھی میرے دل نے اس ہوش ربا منظر کی لذت کو اپنے
لب سے دور نہ کیا تھا کہ شہزادے پھر اُلٹے پھر کر آئے۔ اور فرمایا۔
تمہارا نام کیا ہے۔ میں نے قبا کے دامن کو اس طرح مضبوط پکڑ کر
کہا گویا میں ایک بھاری چیز پر سہارا دیتی ہوں۔ میرا نام مہر النسا ہے۔
امیر غباث کی بیٹی۔ شہزادے نے پھر ایک مایوس مگر ان کہی نظر مجھ پر

ڈالی۔ اور محل کی جانب چلے گئے۔

بس وہی مہرالنساہوں بنگالہ کی ملکہ بنی بیٹھی تھی۔ ستوہر بنگالہ کا حاکم زائچہ دیکھ کر بولا بیگم تاج تمہارے سر پر قربان ہوتا نظر آتا ہے خاوند کا یہ کہنا تھا۔ باغ والی بات کانٹے کی طرح دل میں کھٹکی۔ مگر زباں سے پردہ کیا۔ بولی سرتاج شاہی تمہاری ذات ہے۔ تم سلامت ہو تو ملکہ ہند ہوں۔

جہاں گیری تیغے نے شیر افگن خاں ستوہر کا کام تمام کیا۔ میں قیدی بنی حرم شاہی میں آئی۔ شاہ نے پیام نکاح بھجوایا۔ میرے دل نے غم بھلایا مگر زباں پر یہی آیا۔ کہ لونڈی غمگین ہے۔ اس سے یہ چھیڑ خلاف آئین ہے۔

وقت بدلا۔ بستر شاہ تک پہنچی۔ محل کی ملکہ بنی۔ فرمانوں اور سکوں پر نورجہاں درج ہوا۔ ملواریں قدموں پر سر ٹیکنے لگیں سرکش امرا گردنیں جھکا کر سلام کرنے لگے اور میرے سوا اے ٹرے ہندوستان میں کوئی عزت والا۔ عیش و راحت والا۔ اقبال و قسمت والا نہ رہا۔

ستوہر تاجدار۔ یا ستوہر تاج تار کی حالت آخری دیکھی تو ابھی اولاد کی حکمرانی کا جال سامنے کھلایا۔ فکر و تدبیر کو آگے بڑھایا۔ کانٹے توڑے۔ ٹیلے اکھیڑے۔ میدان صاف کیے مگر قسمت میں یہ نہ تھا۔ شاہ جہاں

بڑھ گیا میرے منصوبے کرنے ہیں بادشاہ کے مرتے ہی رانڈ قیدی بنی
گو لائق شاہجہاں نے ہر اس کا سامان مہیا کر دیا۔
اب میں وہی نورجہاں ہوں زندگی موت کو دیتی ہوں اپنی سول سلیاں
کہانی دل سے کہتی ہوں اور مرتی ہوں
آہ میری اجل آئی ہے۔ کاظمی دانی اور سہستا ہی کے امام میں
حال بھی نہ آتا تھا۔
مر جاؤں گی۔ غزلوں اور مجھاجوں کی طرح گور میں جاؤں گی وہاں نہ
کافوری شمع ہوگی۔ نہ پھولوں کا ہار۔ نہ بلبل ہوگا۔ نہ پروانہ۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ سوچتے سوچتے کروٹ لی۔ شال کو سمیٹا جیب حیاب لونڈیوں کو دیکھا
جو پلنگڑی کے آس پاس سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ اور بولی۔ شہناز
کچھ بول۔ نیک قدم زباں کھول۔ دردانہ تو ہی کچھ کہہ۔ ارے
میں مرتی ہوں دیکھو میرا وقت آخر آ پہنچا۔ کیا موت سب کو آیا کرتی ہے
کیا مرنا ہر جاندار کو لازم ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت میں کیا میرا نفس
بھی مراد تھا۔
مجھے اٹھاؤ۔ تکیہ سے لگاؤ۔ شربت لاؤ۔ دو گھونٹ دو۔ جان لبوں پر

آئی ہے۔ اس محل میں کیسی کیسی خوشیاں ہیں سے دیکھیں۔ یہ اجل
اس سب کو ختم کرنے آئی ہے۔ باہر جاؤ کیا سب باغ اُجڑ گئے۔
کیا سب بہرس سوکھ گئیں۔ کیا تمام بلبل خاموش ہو گئے۔ شمع کو دیکھو
کیا وہ بھی پگھل چکی۔ پروانہ پر نظر اُٹھاؤ اس میں کچھ دم ہے یا وہ بھی جل بسا
اُف۔ اس زندگی کی داستان کیسی اَدھوری رہ گئی۔ میں نے تو ابھی کچھ
بھی نہ سنا تھا۔ داستان گو کیوں خاموش ہو گیا۔
مجھے لٹاؤ پنکھا جھلو پسینہ پونچھو۔ ذرا سہارا دو میں ایک بڑی منزل
طے کرنے چلی ہوں۔ بتاؤ کون کون میرے ساتھ چلیگا۔ قبر کی تنہائی میں
کون میرا جی بہلانے ہمراہ جائیگا۔ کوئی نہیں بولتا۔ کوئی نہیں کہتا۔
بی بی ہم چلینگے۔ ملکہ عالم ہم حاضر ہیں۔ ارے کیا تم سب بے وفا ہو گئے
کیا تم نے ایکا کر لیا مجکو اکیلا جانے دینے پر راضی ہو گئے۔
لا الہ الا اللہ۔ الملک للہ۔ الحیات للہ۔ موت بہت جلدی آگئی۔
میں نے تو ابھی دنیا میں کچھ ہی نہ دیکھا۔ اسکا نقارہ ایسی جلدی بج گیا
کفن منگاؤ۔ میں اُسکو دیکھوں ایسا نہو بُرا کپڑا ہو۔ ایسا نہو میرے بدن پر
ٹھیک نہ آئے کیا تم کافور میں اسکو بساؤ گے؟ کیا مجکو معمولی تختے پر لٹاؤ گے
اور کھینچ کھینچکر نہلاؤ گے؟
اُف! میرا دم کھچا ہے میرا سانس رُکتا ہے کیا موت اسی کا نام ہے؟

مجھے چکر آتا ہے میرا سر پھرا جاتا ہے۔ میرے دل پر کسی چیز سے چوٹ لگ رہی ہے اور وہ ان دھماکوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی رگیں دماغ کی طرف سمٹ رہی ہیں۔ میرے سینہ سے کوئی چیز سانس کے ساتھ حلق میں آکر ٹکراتی ہے بدن میں سن سن کی آواز آتی ہے۔ مجھے جمائی لینے دو۔ مجھے انگڑائی آتی ہے اس جمائی نے اس انگڑائی نے میرا جسم مردہ کر دیا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور نیند کا سا غلبہ آنکھوں پر چلا آتا ہے۔ ذرا لینا۔ ذرا لینا۔ میں چلی میں۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علی ولی اللہ۔ وصی رسول اللہ۔

یہ کہتے کہتے ہندوستان کی مشہور تاریخی کتاب مشہور استعار کی کتاب مشہور فلسفہ حیات کی کتاب مشہور تمدن و معاشرت کی کتاب اور حسن و عشق کی پتلی۔ مگر اُسکے جذبات کا بوتا ہوا لوستہ غم دہر۔ اور سُرور کائنات کی بے نظیر بہار دکھانے والی ملکہ۔ مر گئی۔ اور کہہ گئی کہ مرنا سب کو ہے اور مرنا ہی وہ چیز ہے جس سے راحت ابدی یا زحمت دوامی میسر آتی ہے۔

حسن نظامی

موت

زندگی ہر شخص کو نہایت عزیز ہوتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا بشر ہے جو اسکے وجود کی خیر نہیں مناتا۔ بوڑھا ہو یا جوان۔ کمسن ہو یا بچہ۔ ہر شخص

طویل عمر کا طالب ہے اور دنیا کی لذتوں کا مزہ چکھنا اور اسکی آرائشوں میں پھنسا رہنا اہل دنیا کا ایک خاص مداق ہے۔ باری تعالی نے گلشن عالم میں ایسی ایسی مختلف النوع چیزیں خلق فرمائی ہیں جنکو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور اسکی صناعی و حکمت کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے منجملہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسی خوفناک چیز بھی جاندار کے لئے پیدا کی ہے جس سے ہر متنفس پناہ مانگتا ہے۔ اور اس کا نام سنتے ہی آمدیدہ اور رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کانپنے لگتا ہے۔ لرزنے لگتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ موت جو زندگی کی لذتوں اور مسرتوں کو خاک میں ملانے والی ہے اس سے بڑھ کر خطرناک و دل آزار دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بہادر سے بہادر اور دلیر سے دلیر شخص کو آن کی آن میں پچھاڑ دیتی ہے۔ کسی کا اس سے زور نہیں چلتا اور آج تک کوئی اس سے جیت نہ سکا۔

اے موت تجھ سے ایک زمانہ نالاں ہے اور دنیا میں کون ایسا ہے جو تیرے تیر کا نشانہ نہیں بنا اور نہیں بنے گا۔ روز ازل سے تیرا طریقہ تیرا ڈھنگ تیرے تیور۔ تیرا مزاج قاتلوں کی مانند ہے۔ تو جہاں کی رونق کو برباد کر دیتی ہے۔ اے موت تیرا سکہ بحر و بر پر بیٹھا ہوا ہے۔ سارا جہان تیرا لوہا مانے ہوئے ہے۔ تیری کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ اے موت تیری تیغ فنا سے کسی کو اماں نہیں۔ طفل ہو۔ پیر ہو۔ جوان ہو کسی میں تو

امتیاز نہیں کرتی تیرے دل میں رحم نہیں ہمدردی نہیں مروت نہیں۔ تو نے غنچہ ہو یا گل کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ ایک بار اگر کسی نونہال پر تیری قہر و غضب کی بجلی گری تو پھر اُسکی ہستی خاک سیاہ ہو جاتی ہے دنیا جو سوگواری کا لباس پہنے رہتی ہے یہ تیری توجہ کا نتیجہ ہے قصبہ ماتم جو ویران نظر آتا ہے وہ تیرے ہی التفات کا ثمرہ ہے۔ کبھی کبھی ہستیوں کو تو نے خاک میں ملا دیا۔ اپنے پنجۂ الم میں گرفتار کیا۔ آج ہم جن کے دردناک افسانے کان لگا کر سنتے ہیں عبرت و بصیرت کے سبق حاصل کرتے ہیں وہ تیرے جور و ستم سے نالاں سدھارے ہیں اور اپنے اپنے دلوں میں کیسے کیسے حسرت و ارمان لے گئے ہیں تیری سحر اور مخرب اخلاق باتیں قابل بیاں نہیں۔ تو غریب الوطنی کی حالت میں بھی رحم نہیں کھاتی کوئی بیچارہ بھائی بہن۔ عزیز و اقارب سے دور ہے وہ منتیں اور التجائیں کر رہا ہے کہ چند دنوں کی تو مہلت دے کہ آخری دیدار کر لوں مگر تو ایسی بے رحم و سنگدل ہے کہ کسی کی کوئی بات سماعت ہی نہیں کرتی۔ تو اُنکے بھی دباؤ میں نہ آئی اور اُنکو بھی تخت شاہی سے اُتار کر فنا کا لبریز جام پلا دیا جن کا راج پاٹ مشرق سے مغرب تک تھا اور جن کو جور و ستم اور بھی حراج دسا ایسا فرض سمجھتا تھا اب نہ رستم کا نشان ہے نہ اسفندیار کا پتہ۔ نہ افلاطون و بقراط ہیں نہ نیوٹن اور بیکن۔

نہ شکسپیئر کا وجود ہے نہ اڈیسن کا۔ نہ وہ عظیم الشان سلطنتیں باقی ہیں۔ نہ اُن حکماء و علما سفر کا قابل رشک حماؤ ہے۔ غرضکہ تو نے کسی کو نہ چھوڑا اور اُن کی کسی تدبیر کو چلنے دیا۔

پیر فلک کی نظروں میں یہ دلچسپ نظارہ ہے۔ اُسکو وہ ابتدائے آفرینش عالم سے دیکھ رہا ہے اُس نے یاس و نامرادی اور ارمان و حسرت کی خطرناک لڑائیاں دیکھی ہیں۔ اس نے موت و حیات کی باہمی کشمکش کو دیکھا ہے۔ اُس نے روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا تماشا دیکھا ہے اس نے آخری دم کی تکلیف دہ غنودگی ایڑیوں کی ٹپک اضطراب و اضطراب غرضکہ انسان و حیوان کے آخری سفر کے تمام جگر خراش تماشے دیکھے ہیں۔ جب یہ تمام واقعات اُسکی خونخوار آنکھیں دیکھ چکی ہیں تو یقیناً وہ سنگدل ہوگا اور سنگدل کسی پر کیوں رحم کھانے لگا۔

اے موت۔ بہت سے مصیبت زدوں کو دیکھا ہے کہ وہ تیری دید کی تمنا رکھتے ہیں۔ حرماں نصیبوں اور فراق کے ماروں نے تو تجھ پر اپنی پیاری جانیں قربان کردی ہیں پروانوں کو دیکھو کہ وہ اپنی جانوں کو بلا خوف و خطر تیرے حوالے کردیتے ہیں یہ باتیں شاذ طور پر پائی جاتی ہیں مگر اکثر دیکھا گیا کہ تجھ سے ہر شخص بھاگتا ہے اور میرا نام آتے ہی آدمی کی روح قبل از وقت پرواز کر جاتی ہے۔

انسان کی عمر کا جس قدر حصہ ترقی کرتا جاتا ہے آرزوؤں - امیدوں اور مسرتوں میں کمی ہوتی جاتی ہے - لیکن باوجود اُن نامرادیوں کے اُس کے دل میں جینے کی ہوس روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہے - اور اُس کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ جتنی عمر دراز ہوتی ہے اتنی ہی مسرت کا باعث ہے - تاکہ کچھ دن اور باغ زندگانی کی خوشگوار ہوائیں کھائیں -

ضعیفی کی زندگی نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے - اعضائے جسمانی کمزور ہوتے ہیں حواس میں نمایاں فرق - اُٹھنے بیٹھنے میں مصیبت - ذرا ذرا سے کاموں کے لئے دوسروں کے محتاج اور ہر ایک خواہش میں دوسروں کے دست نگر ہیں - ان ہی وجوہات سے سکندر نے دوامی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا - آب حیات کی خواہش ترک کر دی اور صاف کہہ دیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے - سکندر کے سوا دوسرے سے یہ امر غیر ممکن تھا - اس لئے کہ وہ عالم شباب کے جوش میں تھا - کسی بوڑھے سے پوچھو جو ضعیفی کی آئے دن کی سختیوں اور تلخیوں کا مزہ چکھ رہا ہو - وہ کبھی اپنی زبان سے نہ کہے گا کہ مجھکو موت آجائے - کیونکہ باوجود اس تمام مصائب کے وہ زندگی کو نعمت سمجھتا ہے اور اسکی افزونی کی آرزو رکھتا ہے

مرنے کے بعد ہی انسان اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہے - انسانی ہوس کا یہ تقاضا ہے کہ بقائے نام کے لئے قبر پر کتبہ رہے - لوگ آئیں تو

ہمارے نام ہی سے ہم کو یاد کریں۔ ذکر گذشتہ کو دل میں تازہ کریں
باوجود دنیا سے رخصت ہو جانیکے انسانی طمع کی خام خیالی اور خود داری پر
ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ سب لوگ جن کو زندگی میں بڑی بڑی سلطنتیں
تسکین نہ دے سکیں۔ زیر زمین دبے پڑے ہوئے ہیں۔ خاک میں
وہ کاخ و ایوان کہاں! ڈیڑھ دو گز کی زمین پر عوام کی طرح بیٹھے ہوئے
ہیں مگر بظاہر اپنے نام کو جو ایک مدت تک کام عالم کو محو حیال اور گرم تحسین
رکھنے کا دم بھرتا تھا۔ چند سالوں کے لئے فراموشی سے بچانے اور کسی
سیاح کے ایک نظر دیکھ لینے کے لئے کتنے طریقے کیسی کیسی شکلیں اور
کیا کیا صنعتیں اختیار کی گئی ہیں۔

یہ قاعدہ ہے کہ دوست و احباب چیز بست۔ پالے ہوئے جانور۔
بنائے ہوئے مکان۔ لگائے ہوئے درخت اور اسی قسم کی ہزارہا چیزیں
جن کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے ہم کو ان سے اسی قدر محبت ہو جاتی ہے
جس قدر کہ ہمارا اور ان کا ساتھ رہے۔ اور ہماری نظر کے سامنے رہیں
ایک دوست جس سے الفت و محبت کے بینگ پڑ جاتے ہیں۔ اور کسی
قسم کی طرفین میں مغائرت نہیں رہتی ہے اسکی صاف وجہ یہ ہے کہ ہمارا
ان کا بہت ساتھ رہتا ہے۔ ہم وہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اور ہم صحبت
رہتے ہیں۔ ایک مکان میں جو شخص مدت دراز تک اپنی زندگی بسر کرتا ہے

تو اسکو در و دیوار سے الفت ہو جاتی ہے۔ جب وہ اُسکو چھوڑنا چاہتا ہے تو دل میں اُسکے ایک قسم کا درد ہوتا ہے۔ اسکی جدائی شاق ہوتی ہے اسکا فراق تکلیف دہ نظر آتا ہے۔ اُسکا چھوڑنا بہت بُرا معلوم ہوتا ہے کسی مکان کو جو شکستہ حالت میں ہو اور اُسکو بدوستعور سے دیکھتے چلے آئے ہوں۔ اگر اُسکو گرتا دیکھیں گے تو ہم کو رنج ہوگا افسوس ہوگا۔ ایک خاص کیفیت دل پر طاری ہو جائیگی ان چیزوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ بات ہمارے خمیر میں موجود ہے کہ جس چیز کو ایک عرصہ تک دیکھتے رہتے ہیں۔ اُس سے دلی اُنس ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جو ہم کو ترقی عمر کی خواہش میں علطان و پیچاں رکھتی ہے۔ کیونکہ زندگی کا بڑا حصہ دنیا میں بسر ہوا۔ اس لئے طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ ہم اس سے الگ رہیں۔ ان عارضی و نمایشی چیزوں کا ساتھ چھوڑ دیں اور وہاں جا کر بسیں جہاں کے حالات و واقعات سے ناواقف۔ طرز معاشرت سے بے بہرہ رسوم و رواج سے ناآشنا ہیں۔

دنیا کی ہر شے میں گو رفتار زمانہ کے ساتھ انہدام کے آثار نمایاں ہیں مگر اس شکستگی پر بھی موتر اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی سبب سے ہم دنیا میں زندہ رہنے کے آرزومند ہیں۔ اور اے موت تجھ سے پناہ مانگتے ہیں جو لوگ دنیا و مافیہا کو فانی سمجھتے ہیں جو حقیقت میں خالی ہی ہے

وہ دنیا سے اپنی دلبستگی نہیں پیدا کرتے کہ موت کا خیال انہیں سوہان روح ہو۔ وہ دنیا کی خواہشوں میں اس قدر محو نہیں ہو جاتے کہ موت سے غفلت ہو جائے یہ اہل اللہ ہیں۔ ابرار و احرار ہیں کہ موت سے ڈرتے نہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آنے کے وقت نہ آئے کے ہی رہے گی۔ موت کا وقت انکے اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ وہ راضی برضا رہتے اور جان مستعار کو سچی جان آفریں کے حوالے یہ کہتے ہوئے کر دیتے ہیں کہ

جاں دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

موت کا ڈر اُن ہی کو زیادہ ہوتا ہے جو لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور لہو و لعب میں اپنی عمر عزیز کو گنوا دیتے ہیں۔ موت کا خیال کر کے نیکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جب موت کا وقت آجاتا ہے تو سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ افسوس ہم نے توشۂ آخرت کی کچھ فکر نہ کی منزل دشوار گذار ہے کیونکر طے ہو گی۔ مرائیاں سامنے آکر انہیں موت کا خوف دلاتی ہیں کہ دیکھو تم اپنے ساتھ ہم کو لئے جاتے ہو دنیا میں رہنے سہنے کھانے پینے پہننے۔ آرام و آسائش پانے کا تو ہر طرح خیال رکھا کوشش کی۔ مگر اب جہاں جا کے رہو گے وہاں کے آرام کا کوئی خیال نہ کیا۔ اب تمہارے ساتھ نہ تمہاری بیوی ہو گی نہ بچہ نہ کوئی عزیز نہ دوست۔ اکیلے قبر کے تنگ و تاریک حجرے میں پڑے رہو گے۔ جو لوگ دم بھر کو

تم سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اب تمہیں کبھی پوچھنے (فاتحہ خوانی) کے لئے بھی نہ آئیں گے۔ افسوس ہے کہ زندگی یوں برباد ہوگئی اور مرنے کے بعد کی کچھ فکر نہ ہوسکی دیکھو کیسے کیسے شاہان اولوالعزم فنا ہوگئے۔ نہ وہ رہے نہ اُن کے ایوان و محل۔ نہ اکثر کے مزار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہوش بلگرامی
ایڈیٹر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن

از رسالہ ترجمان لاہور

۷۸۶

غالب مرحوم

جس نے اردوئے معلےٰ یعنے رقعات غالب کو پڑھا ہے وہ شہادت دے سکتا ہے کہ اُنکے خطوط کی اوسط نکالی جائے تو ساٹھ فیصدی خطوں میں موت کا ذکر ہے۔ کہیں وہ موت کی آرزو کرتے ہیں۔ کہیں انہوں نے موت پر سرور ابد کا انحصار رکھا ہے۔ کہیں اپنے مرنے کی پیشگی تاریخ کہی ہے غرض موت کی یاد ہر وقت انکے قلم کی زبان پر رہتی تھی۔

عدر ۵۷ء میں انکی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے انقلابات ہوئے اور متعدد امرا یہاں سیوں پر لٹکے اسکے اثر سے انکے ادبی جذبات ہر وقت مرگ آلود رہتے تھے۔ رقعات غالب پڑھ کر بے اختیار رونا آتا ہے۔ کیونکہ غالب نے اپنی سادہ اور بے مثل بولتی ہوئی تحریر میں لاجواب

کمال سے ان حالتوں کا نقشہ کھینچ کر دکھا دیا ہے۔ میں اس کتاب کے ناظرین سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ رقعات غالب اکثر اوقات پڑھا کریں۔ اگر انکے دل کو انقلاب ایام کی بہار دیکھنے کا شوق ہو۔ اسوقت انکو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کا یہ سب سے بڑا فلسفی شاعر کس قدر موت کو یاد رکھتا تھا۔ اور نجات آخرت کی اس کو کس قدر فکر تھی۔ اکثر خطوط میں دستخط کرتے وقت یہی لکھا ہے۔ نجات کا طالب غالب۔

وقت وفات کے حالات میں نے جناب نواب سعد الدین احمد خاں صاحب طالب خلف جناب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیر دہلوی سے دریافت کئے تھے انہوں نے جو تحریری جواب بھیجا ہے وہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ دیکھو جس نے موت کو یاد رکھا وہ باوجود شرب مدام خدا کی رحمت سے بخشا گیا۔ حسن نظامی

۸۶ جناب طالب دہلوی کا مکتوب

نرع عالب کی نسبت

از دہلی۔ گلی قاسم جان ۱۵۔ اپریل ۱۸۷۰ء

دسمبر ۱۸۷۰ء

حضرت۔ السلام علیکم جہاں عالب مرحوم کی نسبت جو کچھ وقت نرع

سنا۔ اور دیکھا تھا۔ لکھہ کر ملفوف خط ہذا ہے۔ اور کچھ مجکو علم نہیں والسلام
ہاں ایک نقل مولوی اموں جان صاحب مرحوم ولی تخلص جو ارشد تلامذہ
غالب مرحوم سے تھے کی زبانی لکھتا ہوں۔ وہ مجھہ سے فرماتے تھے
کہ بعد انتقال مرزا صاحب مرحوم میں پانی پت میں جناب مولانا
غوث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں گیا
ایک روز میرے جی میں آیا کہ میرزا صاحب کے انجام کی بابت حضرت سے
دریافت کروں سو قبل اسکے کہ میں کچھ پوچھوں حضرت صاحب نے
بوقت ملاقات میرے حدیث باطن کو دریافت فرماکر خود بخود حاضرین کی
طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ بھئی غالب مرحوم بھی اپنے فن میں یکتائے
روزگار تھا اور غالباً اللہ جل شانہ نے اُسے بخش دیا کیونکہ دم باز پسیں وہ
بارگاہ جناب الٰہی میں عرض کر رہا تھا کہ اے پروردگار عالم جس کام پر تو نے
مجھے مامور کیا تھا وہ جس طرح اور جیسا مجھ سے ہو سکا میں نے انجام کو پہنچایا
اب میری معذرت تیرے ہاتھ ہے۔ سو وہ ارحم الراحمین ہے سب کی سنتا ہے
اور دعا قبول کرتا ہے۔ احقر العباد طالب

یادداشت وقت نزع

غالب مرحوم نے انتقال سے چند روز پہلے مولوی بہاء الدین صاحب
مرحوم کے سامنے یا ہاتھ پر زبہ کی تھی مولوی صاحب مرحوم موصوف

حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے خاندان کے استاد تھے حکیم غلام رضا خاں صاحب مرحوم نے مولوی صاحب کو اپنے ہمراہ لاکر توبہ کرائی تھی میں مدات خود اس وقت موجود نہ تھا مگر یہ واقعہ میں نے ان کے قریب الوقوع ہی سنا تھا حضرت غالب مرحوم پر انتقال سے دو تین روز پہلے غش طاری ہو گئے تھے اس حالت میں اکثر میں انکی خدمت میں حاضر رہا کبھی مگس رانی کرتا کبھی اور کچھ جو تیمارداری کے متعلق ہوتا اسی غشی کی حالت میں یا جب دوا و غذا کے لئے حضرت کو بیدار و ہوشیار کیا جاتا تھا تو اکثر صرف (اللہ) زبان مبارک سے نکلتا تھا اور کبھی کبھی (اللہ موجود) اسکے سوا میں نے کوئی اور لفظ انکی زبان سے نہیں سنا۔

۷۸۶ نامی مسلمانوں کے اقوال

موت کے متعلق

یہ کتاب کم ٹو موت میں نے اس نیت سے لکھی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو آخرت کی زندگی یاد دلاؤں۔ یا موجودہ زندگانی کا انجام فنا سامنے لاؤں تاکہ وہ عقبیٰ اور موت سے غافل نہ رہیں۔ کیونکہ بعض اثرات مغربی نے انکو شوق زیست کا اس قدر دیوانہ و متوالہ سا دیا ہے کہ آخرت کا خیال بھی کبھی انکے ذہن میں نہیں آتا۔

ذیل میں آخر زمانہ کے ان نامور مسلمانوں کے اقوال فنائیہ درج کئے جاتے ہیں جو نیچری مشہور ہیں۔ اور جنکو نئی روشنی والوں کا پیشوا سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے عام طور سے انکی دنیا پسندی اور آخرت فراموشی کی شہرت ہے لیکن جب انکی باتوں کی کیفیت پڑھی جائیگی تو ہر نئی روشنی والے کو عبرت آئیگی کہ جنکی تقلید اور پیروی میں اس نے وقتِ اجل کو دل سے دور کیا تھا وہ سب کے سب خدا اور موت کو ہر وقت یاد رکھنے والے تھے۔ اور ہم لوگوں نے خواہ مخواہ انکو منکر آخرت تصور کرکے اپنے الحاد و انکار کا بار اُنکے ذمہ لگایا ہے۔

شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد مرحوم

کا نام نامی کون مسلمان نہیں جانتا۔ ہر پڑھے لکھے عورت مرد کی زبان پر انکا نام ہے اور ہر تعلیم یافتہ دل میں انکا احترام ہے۔ انکی قومی۔ علمی۔ دینی خدمات نے ذکور و اناث دونوں کو دماغی۔ ذہنی فائدے پہنچائے ہیں۔ مگر بعض خود غرض لوگوں نے لگاتار کوششوں سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ملحد۔ منکر آخرت۔ اور عقائد اسلامی کے برہم کنندہ ہیں۔ اور اس شہرت نے ابتک لوگوں کے دلوں میں یہ بات جما رکھی ہے۔ لہذا میں ڈپٹی صاحب کا ذکر چند الفاظ میں سناتا ہوں

اس سے معلوم ہو جائیگا کہ جو لوگ عداوت سے انکو منکر آخرت کہتے تھے وہ بھی جھوٹے۔ اور جن نوجوانوں نے ڈپٹی صاحب کی تقلید کی آڑ لیکر حیات عقبیٰ سے انکار کیا ہو وہ بھی احمق و دیوانے۔

ڈپٹی صاحب کی رحلت سے چند ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ راقم الحروف اُنکی خدمت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ اس زمانہ میں انکی زبان پر آیات قرآنی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور آیات بھی فنا۔ بے ثباتی کائنات۔ اور موت و عاقبت کی فکر پڑھتے تھے۔ اور زار و قطار روتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا۔ جناب اس قدر مضطرب ہونا اور ہر وقت موت کے خیال سے دل کو بے قرار رکھنا اصول جدید کی بموجب صحت جسمانی کو مضر ہے۔ فرمایا صحت جسمانی کس مردود کو درکار ہے۔ صحت روحانی اور صحت ایمانی خدا دے۔ اور وہ یاد آخرت کے بغیر ہوتی نہیں۔

ان کا تکیہ بہت میلا تھا۔ میں نے ازراہ بے تکلفی و شوخی عرض کیا۔ میرے ایک دوست ہیں خدا نے انکو دولت دنیا سے مالا مال کیا ہو مگر وہ اپنی جان کو آرام نہیں پہنچاتے اور میلے کچیلے بستر میں آرام کرتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس اشارہ کو سمجھ گئے۔ پیرائہ ہنسی کا تھا مگر وہ رونے لگے۔ اور فرمایا۔ تمہارے دوست کو اگر اُجلے میلے بستر کی پروا نہیں ہے تو کچھ حرج نہیں۔ انکی قوم کا بڑا حصہ میلے بچھونوں میں مفلسی کے سبب آرام کرتا ہے۔ خیال آخرت کے بستر کا کرنا چاہیئے۔ دیکھئے

وہ کیسا ملتا ہے۔ لحد کے حاکی فرش پر سونا ہوگا یا خدا اپنے فضل سے کوئی اچھا بچھونا دیگا۔ یہ کہکر وہ اس قدر روئے کہ میں شرمندہ اور بے خود ہو گیا۔ کہ ناحق میں نے ایسی بات کہی اور ان کا جی دکھایا۔

مسٹر عبدالرحمن بی اے وکیل دہلی ایام خردسالی میں ان سے کچھ پڑھا کرتے تھے اور خلقت نے مشہور کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ان سے تعلق عشق رکھتے ہیں۔ ایک دن میں گیا تو مسٹر عبدالرحمن پڑھ کر جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا ڈپٹی صاحب نے ایک خاص انداز محبت سے انکو رخصت کیا۔ وہ چلے گئے تو میں نے کہا۔ عبدالرحمن بہت ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ فرمایا۔ یہ بھی تو کہو کہ نذیر احمد جان ہار نظر آتا ہے کیونکہ یہ دنیا جب ابتدا دکھاتی ہے تو انتہا بھی دکھلاتی ہے میں بولا۔ ہر ہر نہار جان ہار ہے۔ اس کا ذکر بیکار ہے۔ کہا ہونہار وہی ہے جسکو جان ہاری یاد رہتی ہو۔

ایک روز تزکیۂ نفس اور صفائی باطن پر گفتگو ہونے لگی۔ بولے ہم ظاہری احوال کی صفائی میں ایسے لگے کہ سلطنت و دولت ظاہر پر جھاڑو پھر گئی میں نے عرض کیا۔ نتیجہ منطق یہ نکلے گا کہ دولت و ثروت ہم کو ملیگی تو حکومت باطن پر جھاڑو پھر جائیگی۔ سنجیدہ تبسم سے جواب دیا۔ رونا تو اسکا ہے کہ نہ خدا ملا نہ صنم کا وصال۔ اب تو دونوں حالتوں میں روال ہے۔

آخر زمانہ میں انہوں نے چند استفال سلسلہ حیثیتہ لطامیہ کے مجھ سے دریافت کئے

میں نے سنائے تو اس طرح جرح و تحقیق کی گویا انہیں پہلے سے معلوم تھے فرماتے تھے میں نے عاقبت کے خیال کو کبھی جی سے دور نہیں کیا۔ یہ نہ سمجھنا اب ٹرہا ہے میں موت کو یاد کرتا ہوں۔

ترجمہ قرآن شریف کا تذکرہ تھا۔ کہنے لگے۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو آخرت کے سخت عذاب سے بچالے۔ میں نے ہدایت رسانی کی موجب قرآن کا اردو ترجمہ کیا تاکہ آخرت کی تجارت سے نفع حاصل ہو۔ مگر اب لوگ دنیاوی تجارت کے لئے ترجمے کرتے ہیں اور میرے ترجمہ کو اس لئے برا کہتے ہیں کہ وہ انکی تجارت کے سد راہ ہے میں نے کہا حسد بھی دنیا کا عذاب الیم ہے۔ آپکو آخرت کے عذاب سے ترجمہ کی برکت سے نجات ملیگی اور دنیادار تاجر دنیاوی حسد کے عذاب الیم میں مبتلا ہو گئے اسکا خیال ہی نہ کیجے۔ بولے مسلمان کو دوسرے مسلمان کی آخرت کا ہی خیال رکھنا چاہیئے۔ آخر میں مسلمان ہوں کیونکر اس کا خیال نہ آئے۔

مارہا یہ ہوا ہے میں گیا ہوں۔ اور ڈپٹی صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ کر اور رو رو کر فرمایا ہے۔ دعا کرو دعا کرو کہ موت کی سرل آسان ہو اور اعمال کی پیشی میں خدا کامیابی دے۔ ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ انتقال سے پہلے زبان بند ہو گئی تھی جب تک بولنے کی طاقت رہی کرچھا زبان پر رہا اور عبرت عبرت کہے فرماتے رہے انکی صاحبزادی نے علاج کے لئے دریافت کیا تو کہا تمہیں اختیار ہے مرد بدست زندہ

شمس العلما مولانا حالی مرحوم

انتقال سے چند سال پہلے کا ذکر ہے مولانا دہلی میں مجھی نواب محمد کرم اللہ خاں
عرف ہے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے جو مٹیا محل میں واقع ہے۔ میں نے
عرض کیا کسی دن درگاہ شریف کی زیارت کو چلیئے اور مٹی کے محل دیکھیئے۔
مٹیا محل میں کبتک رہیئے گا۔ فرمایا وہاں کی حاضری میری سعادت ہے۔ وہاں
مٹی کے محل نہیں ہیں ظاہر میں ہی سنگ مرمر اور طلائی نقرئی عمارتیں ہیں اور وطن میں بھی
ایک دن میں نے کہا مولانا شبلی آپ کی تصویر دیکھ کر کہتے تھے کہ جیسی تصویر
مولانا حالی کی کھینچی ہے اور اس سے انکی فلسفیانہ شان معلوم ہوتی ہے ایسی
آجتک میں نے کسی مسلمان کی نہیں دیکھی۔ فرمایا انکی عنایت ہے جو ایسا خیال
کرتے ہیں مگر میں بعض قبروں کو دیکھتا ہوں تو ان سے میرے دل پر خود
بخود یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ شخص زندگی میں فلاں مرتبہ کا ہوگا حضرت محبوب الٰہیؒ
کے مزار پر جاکر مجھے انکی زندہ تصویر محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک دن خواجہ تصدق حسین صاحب ڈسٹرکٹ جج دہلی کے مکان پر ٹھیرے
ہوئے تھے۔ جو ملا بیگم کے کوچہ میں ہے۔ میں نے کہا۔ اس محلہ کے سامنے
سنا ہے بہت سے محلے آباد تھے جو غدر ۵۷ء میں ڈھا دیئے گئے۔ فرمایا۔ ہاں
بڑی گنجان آبادی تھی۔ پھر کچھ دیر چپ رہ کر ایک شعر پڑھا جو مجھے یاد نہیں
مگر مطلب اسکا یہ تھا کہ آدمی اپنی آبادی اور پھر آخر کی ویرانی کو سوچتا رہے
تو ماہر کے انقلابات اسکو دنیا اور آخرت میں مفید ہوں۔

علی گڈھ میں کانفرنس تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم اور شیخ غلام محمد مرحوم مالک اخبار وکیل اور مولانا حالی ایک جگہ جمع تھے۔ میں نے کہا مولانا کا تخلص ایک درویش کا سا ہے نواب محسن الملک ہنس کر بولے آپ انکو بھی فقیر بنا لیجے مولانا نے فرمایا۔ فکر آخرت کو استقبال کا رمانہ سمجھتے ہیں۔ حال حیال کہا جائے تو ہر شخص حالی اور فقیر بن جائے۔ میں نے کہا تو پھر نواب صاحب کو حیدرہ کوں دے۔ فرمایا دل کا اور بلا خواہش نمود چندہ اسی وقت آئیگا۔ اور اتنا آئیگا کہ نواب صاحب سے لیا بھی نہ جائے۔

اسی موقع پر دوسری صحبت میں ایک شخص نے کہا آپکے مسدس نے قوم کو زندہ کر دیا۔ وہ بولے۔ زندہ ہو کر مرنے کو یہ بھولے نو بات ہے۔

پانی پت میں ایک دن میں حاضر خدمت تھا حضرت قلندر صاحب کا ذکر آگیا فرمایا جنکو موت عزیز ہوتی ہے انکی زندگی سی ستاں دار رہتی ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ زندوں کی طرح ہر دل عزیز رہتے ہیں۔

ایک دن دہلی کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ کہیں جا رہے تھے۔ میں نے کہا علالت میں اور ضعیفی میں سفر بہت دشوار ہے۔ فرمایا۔ ریل میں کچھ مشکل نہیں۔ البتہ آخرت کا سفر ذرا کٹھن ہے۔ جوانی کی طاقت میں مرنا ہو تو حسرت تو زیادہ ہوتی ہے مگر جسم کی قوت موت کو آساں کر دیتی ہے بڈھا مرتا ہے تو تیمارداروں کا وبال جاں ہو جاتا ہے۔

انکے صاحبزادے مولوی سجاد حسین صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ وقت آخر مولانا کی کیا حالت تھی تو انہوں نے جواب میں لکھا۔

غفلت کی حالت زیادہ تھی۔ سوائے آہستہ آہستہ خدا کا نام لینے کے اور کوئی بات انہوں نے رحلت کے وقت نہیں کی۔

نواب محسن الملک مرحوم

علی گڈھ میں امیر کابل مہمان تھے اور لڑکوں کا دینی امتحان لے رہے تھے۔ نواب صاحب کمرہ سے باہر آئے۔ اور دروازہ پر مجھ سے ملے میں نے کہا۔ کہئے اندر کیا ہو رہا ہے۔ بولے بس وقت دعا ہی امتحان لے رہے ہیں ایسا نہ ہو لڑکے رعب میں آکر الٹا سیدھا جواب دیدیں اس وقت نواب صاحب بہت پریشان اور سراسیمہ تھے۔ میں نے کہا۔ جو لوگ دعا کے قائل نہ ہوں انکو یہ بات نہ کہنی چاہیئے۔ بگڑ کر بولے واہ تمکو ہنسی سوجھی ہے یہاں دم پر بنی ہے۔ میں دعا کا منکر کب ہوں۔ ماتم ہی عوام کی طرح مجھکو بے دین تصور کر لیا ہے۔

میں نے کہا خدا نہ کرے۔ میں تو ہنستا تھا۔ میں تو یہاں تک دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو آخرت کے امتحان میں بھی کامیابی دے۔ یہ سن کر نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دوڑ کر مجھکو لپٹ گئے اور کہتے رہے اس میں انتقال سے ایک مہینہ پہلے بمبئی میں مقیم تھے اور میں روزانہ ان سے ملا کرتا تھا شام کے وقت ہوا خوری کو ساتھ جاتے تھے۔ ایک دن جوبلی پر نواب راوہ نصر اللہ خاں کے بنگلہ پر گئے۔ انسے مل کر باہر نکلے تو ان کی فقیر دوستی کا ذکر کرنے لگے میں نے کہا آج کل کی اصطلاح میں تو یہ احمق

فرار پائیں گے جو خلاف عقل باتوں کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہنے لگے حاتم وکلا۔ میں انکو بڑا عاقل سمجھتا ہوں اور دانشمند وہی ہے جو عقبیٰ کو یاد رکھے اور اسکے لئے کچھ ساماں جمع کرتا رہے۔

بمبئی میں ایک دن سمندر کے کنارے پہاڑی بنگلہ پر انہوں نے میرے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی میں نے سورہ الہکم التکاثر اول رکعت میں تلاوت کی اور دوسری میں انا اعطنا۔ نماز کے بعد کہنے لگے۔ آپنے مفاخر کو مقدم اور کثرت حیات کو موخر کہا مجھے اس سے بڑی تقویت ہوئی۔ جو شخص آخرت کو مقدم رکھے گا اسکو حیات دنیا لازوال ملے گی۔ میں نے کہا زرتم المقابر پر آپکا عمل کم دیکھا کہنے لگے امت میں تکاثر بھی تو اب کم ہے۔

ایکس واٹس ہوٹل بمبئی میں بیٹھے تھے۔ نواب صاحب کے سر میں کوئی زخم تھا جراح سے اسکا کھرنڈ چھیلنا چاہا تو کہا۔ اب میں کھرنڈ صاف کرتا ہوں۔ بولے یہ چاہتا کیا ہے۔ چھیل ڈال میں نے کہا تکلیف کی اطلاع دیتا ہے کہنے لگے خدا نے موت کے سوا آجتک کسی تکلیف کی اطلاع نہیں دی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے خبری میں تکلیف ہو تو اسکا حس کم ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت تکلیف کی چیز نہیں ہے ورنہ اسکی اطلاع سبھوں کو نہ ملتی۔

سلمہ جا رہے تھے۔ اور یہ میری آخری ملاقات تھی کیونکہ اسی سفر میں سلمہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

آپ اسماح نوکر نے آکر کہا۔ سرکار میں ہمراہ نہ جاؤں گا۔ مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ کہنے لگے۔ جا۔ پوچھتا کیا ہے۔ میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں

تو بھی ایسے گھر جا۔
میں نے کہا آپ کا گھر شملہ پر ہے یا قبلہ پر۔ مسکرا کر بولے قبلہ والے کی اطاعت کروں تو قبلہ ہی گھر ہے۔ یہ نوکر بڑا ستریر ہے۔ روز ستاتا ہے مگر میں جب سوچتا ہوں کہ اپنے آقا کی نافرمانیاں کرتا ہوں اور وہ رزق دینے سے ہاتھ نہیں کھینچتا تو ان مجاری ملازموں کی ستوساں ناگوار نہیں ہوتیں۔
میں نے کہا آپ کا آقا یہاں کچھ نہ کہے۔ آخرت میں تو اعمال کا اور نوکری کا حساب لے گا۔ یہ سن کر نواب صاحب رونے لگے اور کہا۔ ہاں بے شک سچ کہتے ہو۔ مجھے ہر خوشی کے موقع پر مرنے کا خیال ضرور آجاتا ہے اور میں خدا کے حساب سے ڈر جاتا ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خوشی پر گھمنڈ اور تکبر پیدا نہیں ہوتا۔

شمس العلما خان بہادر مولانا ذکاء اللہ مرحوم

ایک دن دہلی کی پبلک لائبریری میں مولانا تشریف رکھتے تھے۔ میں اور شنکر لال بیرسٹر دہلی اُنسے باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں غدر ۵۷ء کا ذکر آگیا مولانا نے کہا غدر میں اسی کمپنی باغ کے اندر میں نے ایک انگریز کی لاش دیکھی جو دھوپ میں پڑی تھی اور حرمی بگل بگل کر زمین پر بہ رہی تھی۔ مجھے اس سے بڑی عبرت ہوئی اور موت یاد آگئی۔
شنکر لال نے ہنس کر کہا۔ اوہ آپ کو بھی موت یاد آگئی۔ مولانا کو

یہ فقرہ ناگوار ہوا اور وہ حیب ہوگئے شنکرلال چلے گئے تو مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ یہ لوگ آزادی کے نشہ میں ہم بڈھوں کو سرکار انگریزی کا خوشامدی سمجھ کر ہنسی میں اُڑاتے ہیں میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ موت کا یاد کرنا نومسلمانی کی نشانی ہے۔ میں ہر روز ایک مرتبہ مرنے کا تصور ضرور کرتا ہوں۔ اور اس سے مجھے دنیاوی کام کاج میں بڑی مدد ملتی ہے میں نے کہا یہ کیونکر۔ فرمایا جسکو مرنے کا ہر وقت خیال رہے تو وہ وقت بے کار نہیں کھوتا اور جلدی جلدی کام کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے کل خبر نہیں زندگی رہے یا نہ رہے۔

مولانا کا آخر وقت آیا تو انہوں نے دہلی کے ایک مشہور چشتی نظامی درویش جناب میاں عبدالصمد صاحب کو بلایا اور انکے ہاتھ پر توبہ کی اور انکے بتائے ہوئے اوراد استعمال پڑھتے پڑھتے جان دیدی

نوابؒ وقار الملک مرحوم

کی نسبت تو کچھ لکھنا عبث ہے ہر شخص انکی مذہبی متعلقیت اور عبادت گزاریوں سے آگاہ ہے تاہم چند مقولے دلچسپ یاد تھے ان کا ذکر اس سلسلہ میں موزوں معلوم ہوا۔

ایک دفعہ علی گڈھ میں ان کا مہمان تھا اور بارہ والے بنگلہ میں ٹھیرا ہوا تھا اس بنگلہ پر چھپر پڑا ہوا ہے میں نے باتوں باتوں میں کہا۔ اس بنگلہ کا نام

تار والہ ہے۔ مگر یہاں تار کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ آپ چونکہ خدا سے تار برقی باتیں کیا کرتے ہیں اس واسطے اس کا نام تار والہ مشہور ہوا ہوگا۔ یا جہیر کے جتنے مکان ہوتے ہیں ان میں خدا کے تار آیا کرتے ہیں۔

نواب صاحب بہت ہنسیں اور حتک مزاج تھے۔ فرمانے لگے معاذ اللہ میری کیا ہستی ہے جو خدا کے تار مجھ تک آئیں۔ مجھے تو ایسے تار بس کا کھٹکا لگا رہتا ہے دیکھیے یہ وہاں کیونکر رسائی پائے گا۔

ایک دن اسی سلسلہ میں فرمانے لگے کسی کامل درویش کا پتہ بتائیے جس سے باطن کی اصلاح کراؤں۔ میں نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین قادری چشتی جادہ نشین پھلواری شریف عظیم آباد کا نام لیا بولے موقع ہوا تو خود حاضر ہونگا۔ میں نے کہا۔ آپ مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں یہ سب سے بڑی اصلاح باطن کی ہے اگر کام ایمان اور دیانت سے ہو جیتم پر آب ہو کر بولے۔ یہی خوف تو ہے کہ میرا نہ سالی سے کمزور کر رہا ہو ایسا نہ ہو کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور عاقبت برباد ہو۔ لوگوں کو بڑا ہونے کا شوق ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ بڑائی میں بڑے بڑے خطرے ایمان کے لئے ہیں۔

ایک دن حاذق الملک صاحب کے ہاں دہلی میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ایک تسبیح تحفہ میں دی فرمایا دعا کیجیے اسکے پڑھنے کی توفیق ہی ہو۔ میں نے کہا آپ پڑھیں یا نہ پڑھیں مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ اسکو روز دیکھ لیا کیجیے کہ اس کا امام سب والوں کی نیرہ بندی کا ذمہ دار ہے۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور دیر تک نہ بولے میں نے کچھ اور ذکر چھیڑا تو اس کا جواب ہی نہ دیا۔ اتنے میں حکیم صاحب آ گئے۔ اور نواب صاحب ان کے ہمراہ سوار ہو کر اور سلام کر کے چلے گئے مجھے

خیال ہوا نواب صاحب نے میرے کہنے کا بُرا مانا۔ دوسرے دن پھر ملا۔ تو فرمایا آپ کی بات مرتے دم تک یاد رہے گی کل مجھ پر اس قدر اثر ہوا کہ میں اپنی موجودہ ذمہ داری سے ڈر گیا۔ میں نے کہا مبارک ہو ڈرنے والے کی عاقبت بخیر ہے۔

نواب صاحب کے صاحبزادہ مشتاق احمد بیمار تھے۔ اور نواب صاحب ان کے ساتھ کالکا قریب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میں مزاج پرسی کو گیا۔ تو چلتے وقت فرمایا۔ بچہ کی صحت حیات اور میری صحت ممات کے لئے دعا کیجئے۔

ایک دفعہ ریل میں ساتھ ہوا۔ نواب صاحب کے ہمراہ جانماز اور وضو کا لوٹا ضرور ہوتا تھا میں نے کہا اگلے زمانہ میں مسلمان مسافر کفن ہی ساتھ رکھتے تھے۔ اب بڑوں میں صرف آپ باقی ہیں جو جانماز اور لوٹا مسواک تو کم سے کم ساتھ رکھتے ہیں۔ کہنے لگے۔ یہ تو اللہ کا حق ہے اور کفن بندہ کا حق ہے۔ خدا کا حق ادا ہو جائے تو بندگی کے حق کا وہ خود سامان کر دے گا۔

ایک مسلمان کی سفارش لیکر علی گڈھ میں انکے پاس جانا ہوا۔ تو انہوں نے اسکی تعمیل سے انکار کیا۔ مجھے سو کہا جواب ناگوار گزرا۔ اور میں نے بے ساختہ کہا۔ ڈریئے موت کا وقت قریب ہے آپ ایک بیکس مسلمان کی مدد سے انکار کرتے ہیں ایسا نہ ہو مرنے کی بیکسی میں خدا بھی آپ کی مدد سے منہ پھیر لے۔ میری درشت کلامی سے ناراض نہ ہوئے۔ اور فرمایا۔ آپ نے بہت خوب ارشاد کیا خدا میں مدد کرنے کی طاقت ہے وہ کبھی اپنے بیکس بندہ سے منہ نہ پھیرے گا

اور مجھ میں طاقت نہیں تو کیونکر اقرار کروں۔
اسکے بعد انہوں نے انکار کی وجوہات کو مفصل بیان کیا۔ اور میں نے مان لیا کہ بے شک نواب صاحب کے اختیار سے وہ کام باہر تھا۔
مسٹر آرچیولڈ رسیل کالج سے نواب صاحب کی ان بن ہو رہی تھی۔ اسلامی و ملکی اخبارات نواب صاحب کی حمایت میں دھواں دھار مضامین لکھ رہے تھے اسی زمانہ میں ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا ان دنوں آپ کو بہت مصروفیت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حق پر آپ ہیں یا فریق ثانی۔ فرمانے لگے لوگوں نے مخالفت سمجھ رکھی ہے۔ حالانکہ محض اختلاف رائے ہے۔ وہ فرد حاکم۔ میں فرد محکوم۔ میرا ان کا مقابلہ کیا۔ فرض منصبی کی کشمکش تو زندگی کا لازمہ ہے مجھے تو فکر نفس و شیطان کا رہتا ہے جو ہر وقت آخرت اور عاقبت کی بربادی پر تلے ہوئے ہیں اور ہم ان سے بے خبر ہیں۔

شمس العلما مولانا شبلی مرحوم

دہلی میں ایک دفعہ مولانا فقیر خانہ پر تشریف فرما تھے بازار میں کوئی شخص گاتا جاتا تھا۔ فرمایا اسکو یہاں بلانا چاہیئے۔ بلا لیا گیا۔ اس نے گایا۔

بام پر نکلا نہ کر اے ماہ رو
چاندنی چھو جائیگی۔ میلا بدن ہو جائیگا

محظوظ ہوئے۔ گانے والا گیا۔ تو فرمانے لگے۔ چاندنی سے بدن میلا ہونے کا شاعر کو ڈر ہوا۔ مگر بام پر چڑھ کر تو نور ایمان کی صفائی بھی دستوار ہوتی ہے۔ میں نے

کہا حساب بھی آجکل مالاخانہ پر ہیں ہنسکر بولے لحد کے مردوں کے ساتھ
مالاخانہ پر چڑھے تو کچھ ڈر نہیں عرض کی یہ تو صحیح نہیں۔ لحد کا مردہ تو از بس
آلودۂ تربت ہوتا ہے۔ فرمایا۔ عشاق کی تربت قفس خاک نہیں عالم پاک ہے۔
اسی زمانہ میں میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ درگاہ کے مکان میں تھیں۔ اور
مولانا دہلی کے مکان میں مست کو دفن کرنے ہی میں دہلی گیا۔ اور مولانا کو کہنا
کہلانے لگا۔ انہوں نے پوچھا کہو بیوی کیسی ہیں میں نے کہا اچھی ہیں کہا نا
سا دل کیجئے۔ فراغت ہوئے تو میں نے مرنے کا ذکر کیا۔ بے اختیار ہنس کر
بولے بھئی کمال کیا۔ تمہیں بیوی کا کچھ غم نہیں میری بیوی مری تھیں تو اُسی
دن مولانا ابوالکلام مہمان آئے اور مجھ سے سیدھی طرح بات بھی اُنسے نہ ہوسکی
پھر فرمایا۔ موت بھی عجب سیر ہے بعض اموات انسان پر اچھا اثر کرتی ہیں بعض
بُرا خود اپنی موت کے خیال کا بھی یہی حال ہے۔ خوشی میں ناگوار ہوتا ہے اور رنج میں
بھلا معلوم ہوتا ہے میں نے کہا اپنی کیفیت فرمائیے کہ آپ موت کی نسبت
کیا تصور کرتے ہیں کہنے لگے۔ زندگی مدوہ ہے۔ اور موت تمہارا گھر۔ وہاں رات دن
کے افکار ہیں یہاں ہر وقت کی مسرت۔
بمبئی میں ایک دن ملا شگفتہ مزاجی کی بے تکلفانہ گفتگو تھی میں نے کہا جو یاٹی
کے حسن کو آپ نے کلام میں لقائے دوام دیکر برج خاموش کو ستا کی سنا دیا ہے۔
فرمانے لگے۔ کیونکر۔ میں نے کہا یار سی مرتے ہیں تو برج خاموش میں رکھ دیے
جاتے ہیں عارضی زندگی کی بہار جو یاٹی پر دیکھ کر آپ نے عرلیں لکھ دیں۔
اب برج خاموش کو شکوہ ہے کہ جہاں یہ حسین دوامی عمر بسر کرنے جاتے ہیں

مولانا نے اس کا ذکر کچھ نہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا یہ آپ کے لئے چھوڑ دیا۔
میں بولا۔ تو حسن آخرت کے آپ قائل نہیں۔ فرمایا حسن آخرت ہی کے لئے
حیات متحرک کے حسن کا قائل ہوں۔ آخرت نہ ہو اور اسکو دوام نہ ہو تو جینے اور
چند روزہ بہار کی اتنی زیادہ ہوس نہ ہو۔ میں نے کہا مجھے تو حسن دیکھ کر مرنے کا
خیال آتا ہے۔ اور اس سے حی عجب لطف اٹھاتا ہے۔ فرمایا مجھے آپ کی حالت پر
ترس آتا ہے۔

مدراس کے سفر میں ایک دفعہ ساتھ ہوا۔ وہ سکنڈ میں تھے۔ اور میں تھرڈ
میں مسافروں کی شدت ہوئی تو انہوں نے نوکروں کے درجہ میں بیٹھ جانے
کی صلاح دی۔ میں بیٹھ گیا۔ سکنڈ اور نوکر خانہ کی درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی
تھی۔ مولانا نے کچھ مٹھائی کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر مجھکو دی۔ میں نے ہنس کر
کہا۔ جنت والوں پر دوزخیوں کو کچھ دینا حرام ہے۔ بولے۔ آپ تو اعراف میں ہیں
گاڑی مدراس پہنچی تو استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ میں نے مولانا کے
کان میں کہا۔ کہہ دوں مولانا تھرڈ میں آئے ہیں اور میں سکنڈ میں۔ فرمایا کہہ دو
عاقبت دونوں کی ایک ہے۔ یہ تو دنیا کی منزل تھی طے ہو گئی۔ آخرت آگئی تو
دنیا کی تھرڈ و سکنڈ کے امتیاز اٹھ گئے۔

لکھنؤ میں مولانا کا مہمان تھا۔ انکے ہاں ان دنوں ایک عرب لڑکا خدمت کرتا
تھا۔ اور دروازہ پر بیٹھے رہنے کی اسکو ہدایت تھی۔ میں نے اندر جانا چاہا تو
لڑکے نے روکا میں نے آواز سے کہا مستملی فقیر اسم کے دروازہ پر دربان۔
الٰہی تیری اماں خود باہر آکر اندر لے گئے اور معذرت کرنے لگے میں نے کہا

اگر عزرائیل آئے تو یہ دربان روک سکیگا؟ فرمایا اُن ہی کے لئے تو بٹھایا ہے۔ وہ عربی بولتے ہیں۔ ہندی دربان کی بات نہ سمجھتے۔ اسکے بعد سرسید کا ذکر آگیا کہ وہ موت کی نسبت پورا یقین رکھتے تھے۔ یعنی موت کے بعد حیات دوامی کے قائل تھے۔ میں نے پوچھا آپکا موت کی نسبت کیا خیال ہے۔ فرمایا سبحان اللہ میری کیا بساط ہے جو اس پر کچھ خیال کروں۔ تغیر عالم شاہد ہے کہ موت آئیگی مگر میں موت کو افسوس کی چیز نہیں سمجھتا۔ اور اسی قوم کو زندہ مانتا ہوں جو موت سے خوف نہ کرتی ہو۔ اس زمانہ میں سوائے مسلمانوں کے کوئی دنیا میں بسنے والی قوم موت پر اس قدر شیفتہ نہیں ہے جتنے مسلمان ہیں۔ اور خدا کا احسان ہے کہ میں اُسی برگزیدہ قوم کا ایک فرد ہوں۔ حسن نظامی

۷۸۶ گل و بلبل کی موت

از جناب منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی

خاص رسالہ کم ٹو موت کے لئے

بہاروں سے سنا تھا باغ صدرستک پر یگانہ — کہیں گل محو آرائش کہیں ملبل تھا دیوانہ
نسیم عیش ایسی چل رہی تھی چال مستانہ — گلوں کا بادۂ شبنم سے تھا لبریز پیمانہ
شمیم روح پرور اُڑ رہی تھی مشکبو ہو کر
کنول دل کے کھلاتی تھی بہار آرزو ہو کر

گل خوش رنگ اپنی تازگی پر ناز کرتا تھا — غرور حسن سے اندار پر امدار کرتا تھا
نسیم جاں فزا کو ہمدم و ہمراز کرتا تھا — زمانہ سازبس کر بلبلوں سے ساز کرتا تھا

فدا سو جاں سے بلبل تھا گل کی بات کے اوپر
کبھی اس ڈال کے اوپر کبھی اس پات کے اوپر

رجھانے کے لئے معشوق کو نغمے سناتا تھا — کبھی ٹپہ کبھی ٹھمری کبھی دُھرپت اُڑاتا تھا
خوشی سے پھول کر پھولا نہ جا میں سماتا تھا — وصال گل سے پروانہ کو محفل میں جلاتا تھا
کہ واصل ہو ما معشوقوں سے ہم سے سیکھ پروانے
فراق شمع میں کب تک جلے جائیگا دیوانے

اگر عاشق سا ہو عاشق کی شاں پیدا کر — دل پر غم میں حسرت آرزو ارمان پیدا کر
نگاہوں میں مزاج یار کی پہچان پیدا کر — اگر مرکل کٹھن ہو راستہ آسان پیدا کر
درجاناں یہ سر گھسے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
کہ حل جانے سے کوئی عاشق کامل نہیں ہوتا

عرض یوں طعنہ زن تھا عاشقوں پر بلبل گلشن — کبھی کھٹ پٹ تھی پروانے سے قمری سے کبھی اَن بن
ہزاروں ہیں جہاں میں یوں تو کہنے کیلئے کامل — یہ لیلےٰ میں یہ جوبی ہو یہ شیریں میں ہو یہ جوبن
حسیناں جہاں گل کی برابر ہو نہیں سکتے
جو عاشق ہیں وہ بلبل کی برابر ہو نہیں سکتے

گل و بلبل میں جاری تھیں اہی اسرار کی باتیں — محبت میں مزے سے ہو رہی تھیں پیار کی باتیں
کبھی تقریر رسم کی کبھی گلزار کی باتیں — گلے میں ہاتھ ڈالے یار سے تھیں یار کی باتیں
ملا آئی غضب ٹوٹا ستم ایجاد آ پہنچا
اِدھر گلچیں اُدھر بیداد گر صیاد آ پہنچا

گلوں کو لیگیا چن کے گلچیں ایسی ہولی میں — حسیں گلباریاں کرنے رہے پھولوں سے ہولی میں

شب عشرت کسی نے رکھ لیا شوخی سے جالی میں خلیق رار نے یہ شعر لکھا اپنی بولی میں

قفس میں مرگیا بلبل ہوئی بولوں کی پامالی
گل و بلبل کی باقی رہ گئی ہے داستاں خالی

بادشاہوں اور نامور لوگوں کے آخری کلمے

یعنی وہ کلمات جو دم نکلتے وقت اُنکی زبان سے نکلے۔ جنکے بعد وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

جان رچرڈ گرین (ایک مشہور مورخ) اپنی انگلی نبض پر رکھ کر ڈاکٹر سے مسکراتے ہوئے کہا

"نبض بند ہو گئی لو الوداع"

فیلپ (ایک مشہور ایکٹر) "الوداع تمام میری عظمت کو الوداع"

شہنشاہ رچرڈ اول (برٹرلنڈ ڈی گورڈن سے کہا جسکے تیر سے وہ ہلاک ہوا تھا)

"اے جواں میں تجکو معاف کرتا ہوں"

الگزینڈر اول بادشاہ روس (اپنی ملکہ سے)

"ایلزبتھ آپ تھک گئی ہوگی"

کریمویل "جتنی جلدی ممکن ہو میرا ارادہ چلے جانے کا ہے"

لوئیس پانزدہم (اپنے تیمارداروں سے)

"تم کیوں روتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں میں ہمیشہ زندہ رہوں گا"

"میرا خیال تھا کہ مرتے وقت زیادہ تکلیف ہوتی ہوگی"

لوئیس شانزدہم بادشاہ فرانس (جلاد کے سامنے)

"فرانس میں جو جرم مجھ پر لگائے گئے ہیں میں اُن سے بیگناہ مرتا ہوں"

"خدا سے دعا ہے میرا خون فرانس کے ذمہ نہ ہو۔ اگر ایسا . . . ."

چارلس اول "یاد رکھو"

چارلس ثانی "بیچاری نیلی کو ہو کا مت رکھنا"

جیمس پنجم والی اسکاٹ لینڈ (مرتے وقت ایک لڑکی کے تولد کی خبر سنکر)

"یہ تاج ایک لڑکی سے آیا تھا اور لڑکی کو جائے گا"

(پیدا ہونے والی لڑکی ملکہ میری اسکاٹس کے نام سے مشہور ہوئی)

ملکہ وکٹوریا کے شوہر "مجھ کو دولت، رتبہ، اور اختیار حاصل ہوا لیکن اگر مجھ کو صرف یہی تین چیزیں نصیب ہوتیں تو میں کیسا خوش بخت ہوتا"

ملکہ ایلزبتھ۔ "میرے تمام مقبوضات ایک لمحہ کے لئے اور ہیں"

ولیم سوئم۔ "کیا یہ درد زیادہ دیر تک رہیگا"

چارلس نہم۔ "دایہ، دایہ، کیا قتل، کیا خون ہے، اور میں نے غلطی کی ہے خدا مجھے معاف کرے"

رچرڈ سوئم۔ "بغاوت! بغاوت!!"

گیری بالڈی۔ (دو مردوں کو اپنے کمرہ کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اور اُنہیں اپنے مرحوم بچوں کی روحیں سمجھ کر)

"محبت سے دونوں لیے باپ کو مرتا ہوا دیکھنے آئے ہیں میرے مرنے کے بعد اُن پر مہربانی کرنا اور دانہ کھلانا"

امیر البحر نیلسن (ملاحوں سے)

"انگلستان اپنے ہر ایک فرزند سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض پورے طور سے ادا کریگا"

لوئیس ہشتدہم بادشاہ فرانس۔

"بادشاہ کو کھڑے ہو کر مرنا چاہیئے"

شہنشاہ جارج دویم

"بوئے۔ یہ کیا ہے۔ مجھے لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ موت آرہی ہے لیکن لوگ مجھے ٹھگ رہے ہیں"

ولیم سویم

"یہ تکلیف مدت تک رہے گی"

ملکہ این بولین (جس وقت اُنکی گردن پر قتل کرنے کے لئے کلہاڑا چلایا گیا)

"میری گردن نہایت چھوٹی ہے"

ملکہ ایلزبتھ۔

"اگر مجھے زندہ رہنے کے لئے ایک منٹ اور مل جائے تو میں ایسی تمام دولت دیتی ہوں"

شاہ ہنری ہشتم

بڑھے جاؤ۔ بڑھے جاؤ

حسن نظامی

خاتمہ کے بیان کا خاتمہ ہوا

مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں!

جیتا ہے تو دو گھڑی ہنس بول۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ دنیا میں جو جیہ رسا بس لیکر آیا ہے۔ چاہے رونے میں کاٹ چاہے ہنسی خوشی میں گزار۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ تو ایسا ہنسے کہ مرے کو بھول جائے۔ یہ اُسکی یہ مرضی ہے کہ موت کو یاد کرتے کرتے جینے سے ہاتھ اُٹھالے جیا بھی فرض ہے مرنا بھی فرض ہے۔ جی تو خوش باش جی۔ مر تو خوش باش مر +

کم ٹو موت کے مضامین غم دیکھکر موت کو یاد کیا تو کتاب

چٹکیاں اور گدگدیاں

بھی پڑھ۔ اس سے ہنسی آئے گی۔ دل کی مُردہ اور افسردہ کلی کھل جائے گی کم ٹو موت بھی میں نے لکھی اور غم یاد دلایا۔ اور چٹکیاں و گدگدیاں بھی میری ہی تحریر کردہ ہیں اس میں نہ سی ہنسی کی باتیں ہیں۔ تمدنی ہنسی کی باتیں ہیں۔ ادبی اور انشا پردازی کی ظرافتیں ہیں ہر مضمون کچھ یاد دلاتا ہے چٹکیاں لیکر چوکنا کرتا ہے۔ پھر گدگداتا ہے۔ اے اضیاء ہنسی چہرہ اور دل پر لاتا ہے جس نے کم ٹو موت کو پڑھا اور چٹکیاں گدگدیاں بھول گیا۔ اُس نے جیا نہ جانا چٹکیوں اور گدگدیوں میں رہ گیا اور کم ٹو موت تک ہاتھ نہ بڑھایا۔ اُسکو مزا نہ آیا +

اے خیر اجتک جئے ہنسی دل لگی سے جی۔ میری چٹکیوں کے لئے مارو جھٹکا۔ میری گدگدیوں کے واسطے لعل کھول۔ کہ میرا نام حسن نظامی ہے +

یہ بھی کرتا رہ۔ اور موت کو بھی دھیان میں رکھ۔ کم ٹو موت آخرت یاد دلاتی ہے۔ اس واسطے بیش قیمت ہے۔ ایک روپیہ میں آتی ہے چٹکیاں گدگدیاں دنیا کی ہنسی اور تفریح کے حوالے ہیں لہذا اِن کی قیمت فقط آٹھ آنے ہیں۔ آخرت پوری ہے دنیا ادھوری ہے جسکو مطلوب ہو

پیرزادہ سید محمد صادق صاحب

کارکن حلقۃ المشائخ صوبہ دہلی کے نام درخواست بھیجکر منگائیے

قبروں کے غیبی نوشتے

ایسی قبر اور بڑی گور کے ادبی لطارے اس کتاب میں ہیں۔ ہر قبر ایک نوشتہ اپنے اوپر رکھتی ہے مگر آنکھ پڑھنے کی صلاحیت کہاں سے لائے غریبوں کے گورستان۔ امیروں کے مقبرے۔ اولیاء اللہ کے مزارات سب قدرت کی الواح مخفی سے گوناگوں ہیں ہر تودۂ خاک کے سرہانے مرنے والے کا اعمال نامہ لکھا ہوا ہے۔

مجکو بھی نگاہ کی تلاش تھی جس سے مکتوبات مقابر کو پڑھتا مگر آہ اب تک نہ ملی۔ لاچار قوت ذہن اور طاقت خیال سے کام لیا۔ اور پہلے سرور کائنات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اطہر کے سرہانے ایک تصوری لوح قائم کرکے دیکھی اور اسکی عبارت طاہر کے کاغذ پر نقل کرلی۔ پھر سیدۂ عالم بی بی خدیجہ رض اور بی بی فاطمہ رض کے مزارات کی الواح نقل کیں پھر سیدنا حضرت علی رض حضرت امام حسین رض حضرت علی اکبر رض حضرت علی اصغر رض حضرت بلال رض حضرت رسول حضرت تیمور رض کے کتبات قبور تحریر کیے۔ اسکے بعد ابولہب ابوجہل یزید۔ شمر۔ ابن زیاد کے کتبے لکھے اور آخر میں اپنے استقبال پر پہنچ کر کے حس نظامی کی قبر کو دیکھا تو اسکی لوح ہی لکھ لی۔ اس سب کے مجموعہ کا نام قبروں کے غیبی نوشتے رکھا۔

اس کتاب کو پڑھکر کم ٹو موت کے پڑھنے کا لطف آئیگا کم ٹو موت اسکی شرح ہے اور یہ کتاب اگر غور کرو تو کم ٹو موت کی تفسیر ہے دونوں کا اثر مذہبی ہے۔ تمدنی ہے۔ قومی ہے ملکی ہے ہر کتاب انسان کی ضروریات حیات و ممات کو مفید ہے۔ کم ٹو موت پڑھنے کا مراجب ہی آئیگا کہ قبروں کے غیبی نوشتے ہی پاس ہوں۔

میں یہ تعریف کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں کرتا بلکہ مقصود اصلی کی خاطر اور وہ یہی ہے جو محاورات میں مشہور ہے کہتا ہے کہ اولاد آدم کو مزا بھی آجائے اور چیا بھی سیکھ جائے قیمت اسکی آٹھ آنہ ہے۔

پیرزادہ سید محمد صادق صاحب کارکن حلقۃ المشائخ دہلی سے منگائیے